کرشن چندر

ہندوستانی پبلشرز دلی

قیمت دو روپے
چار آنہ

فہرست

طبع اوّل — مئی — ۱۹۴۴ء

نُکّڑ

سب سے پہلے میں نے تمہیں اپنے گھر کی گلی کے نُکّڑ پر دیکھا تھا۔ گو ہم اکھٹے رہتے تھے۔ لڑائی جھگڑا کرتے، مار پیٹ بھی ہو جاتی، صلح بھی، لیکن میں نے تمہیں اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اور دیکھا تو جب تمہاری شادی ہو چکی تھی اور تمہاری ناک میں ہیرے کی شبنمی بوند جگمگا رہی تھی۔ اور تمہارے سنولائے ہوئے چہرے پر گلاب کی سی موہنی آ گئی تھی نہیں اس سے پہلے میں نے کیوں نہیں دیکھا تھا۔ تمہاری آنکھوں کی اس کجلائی ہوئی سندرتا سے کیوں آگاہ نہیں ہوا تھا۔ تمہاری شخصیت کی کے، تمہارے جسم کی غنائی لذت، تمہاری روح کے بے قرار آہنگ سے کیوں بے خبر رہا تھا، اور دیکھا تو اُس وقت کیوں دیکھا، جب یہ کے، یہ نغمہ، یہ آہنگ غیر کی

زینتِ آغوش ہو چکا تھا۔ اور پھر تمہیں اس طرح دیکھ کر غربت کا احساس کیوں ہوا، کیوں تمہارے داہنے نتھنے میں وہ شبنمی بوند اب تک لرز رہی ہے تمہارے سانولے چہرے پر گلاب کی حیا، نسیم صبحگاہی کی طرح جھلک رہی ہے، کیوں تمہاری نگاہ کے لوچ نے، اُس کی ملائمت نے، اس کے رنیشمیں گداز لمس نے ایک ایسا میٹھا، مکمل، مستقل تاثر پیدا کر دیا ہے جو مٹائے سے نہیں مٹتا جیسے میں اب بھی تمہاری آنکھوں کی چمک کو، اُس نگاہِ غلط انداز کو چھو سکتا ہوں، سُن سکتا ہوں چوم سکتا ہوں، جانتا ہوں کہ اب ایسا نہ ہو سکے گا نہیں، یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ جانتا ہوں، ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں، کہ تمہاری سیندوری چوڑیوں نے اور ساری کے سرسراتے ہوئے آنچل نے نکڑ کے ہر ذرّے کو اپنے سُرخ سائے کی روشنی سے منّور کر دیا تھا۔ اور مری حیات کا رُواں رُواں سمجھ گیا تھا کہ وہ تمہیں آج پہلی بار دیکھ رہا ہے!

اُس وقت میں نے صرف یہ چاہا تھا کہ تم سے پوچھ لوں۔ یہ غیریت کیوں، میں تمہیں کیوں پہلی بار دیکھ رہا ہوں، تم مجھے کیوں نہیں پہچانتی ہو تمہیں پاتے یا نہ پانے کی خیال انگیز مسرت سے مری روح کیوں کانپ رہی ہے سوچا کہ جب تم پھر ملوگی تو تمہیں اپنے سینے سے لگا کر یہ بات پوچھ لوں گا۔ ۔۔۔ وہ

لمحہ اب تک نہیں آیا......

ہر شخص نے تمہیں دیکھا ہے۔ ہر شخص نے تمہیں چوما ہے، جب میں نے تمہیں اپنے سینے سے لگایا۔ اُس وقت بھی تم ایک دکاندار تھیں، اس سے زیادہ نہیں، اور میں ایک اوباش، بدچلن شہری، اس سے کم نہیں، مری زندگی چوک کے کوٹھوں کے چکر کاٹنے میں بسر ہوتی تھی، تمہاری آنکھوں میں کاجل تھا، ہونٹوں پر سرخی کی چاشنی، جسم پر ریشم کی سرسراہٹ، بالوں میں کسی نئی خوشبو کا تبسم رچا ہوا تھا۔ کیا راز و نیاز کی باتیں تھیں۔ جن میں نہ کوئی راز تھا نہ نیاز، افسانہائے حسن وعشق، جن میں نہ حسن تھا نہ عشق میں شعر پڑھ رہا تھا... .. داغ، امیر مینائی. آتش.. . مجروح .. اور تم میرے سینے سے لگی تھیں۔ میری جیب میں سکے کھنکھنا رہے تھے، اور تم اُن کی خاطر مرے شعروں کو کڑوی گولیوں کی طرح نگل رہی تھیں، اور ہم دونوں خوش تھے، مریض بھی اور مرض بھی پیٹنٹ دواؤں کی طرح میں نئے نئے شعر اُگل رہا تھا۔ اور محبت کا ایک مرئی تاثر پیدا کر رہا تھا۔ اور تمہاری آنکھوں کا اضمحلال گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ تمہاری افسردگی کی ملائمت نے، تمہاری بے بس تھکن کی بے چارگی نے، تمہارے مجبور احساس

سپردگی نے مجھے ایک عجب لذت سے آشنا کر دیا۔ .... تم میرے سینے سے لگی تھیں، اور میں اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں سے تمہاری جلتی ہوئی آنکھیں چوم رہا تھا۔ اور تم سے ٹوٹے ہوئے، لڑکھڑاتے ہوئے، اکھڑے ہوئے شرابی فقروں میں اقرارِ محبت کر رہا تھا۔ میں تم سے زیادہ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ پچھلے چھ ماہ سے میں ہر روز تمہارے ہاں آتا ہوں۔ تم سے محبت جتاتا ہوں تمہارے جسم کی ہر لذت، تمہارے ذہن کی ہر کیفیت سے آگاہ ہوں، میں نے تمہیں شادی کے لئے کہہ دیا۔ تم کیوں اس وقت بے قرار ہو گئیں؟ تمہارا چہرہ میری انگلیوں کے ہالے میں تھا، اور میں نے تمہارے چہرے پر اس کیفیت کا انعکاس دیکھا جو زندگی یا موت کی تخلیق پر دیکھا جاتا ہے، تمہیں اچھی طرح معلوم تھا، کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، لیکن پھر بھی یہ عجیب سا نور کیوں؟ جیسے میری نرم گرم بے چین انگلیوں کا ہر لمس نور کی اک کرن بن گیا تھا، اور تمہارا بیضوی چہرہ اس نورانی ہالے میں تھا۔ یکایک تم مجھے مریم کی طرح مقدس نظر آئیں ...... اور تمہاری آنکھوں کی وہ سہمائی کیفیت جیسے روح انگاروں پر لوٹ رہی ہو جیسے ابن مریم دار پر کھینچا گیا ہو۔ اور انگلیوں کی ہر لرزش جلاد کی خونی کھیل ہو، میں نے ان آنکھوں سے اس وقت تمہاری

خوفناک تنہائی کا اندازہ کیا، تمہیں جہنم کی آگ میں سسکتے ہوئے دیکھا، تمہیں یسوع کی طرح پاکیزہ موت کو زندگی کے بے جان لوتھ کے حوالے کرتا پایا، اور یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میں تمہیں نہیں جانتا۔ اس سے پہلے تمہیں کبھی دیکھا نہ تھا۔ تم وہ رنڈی نہ تھیں جو مرے سینے سے لگی تھی؛ بلکہ کسی سات سمندر پار کے ملک کی شہزادی تھیں۔ بہت دور کی رہنے والی اجنبی پرستانی شہزادی؛ کیا جادو تھا وہ۔ کیسا چھلاوہ تھا۔ کیوں آج تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں، اور اس سے پہلے کیوں میں تمہیں نہیں دیکھ سکا۔ اور اتنی گہری یگانگت کے باوجود آج تم اس قدر اجنبی تھیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے، یہ احساسِ غیریت کیوں؟ ... مری روح اب تک اس تصور سے کانپ رہی ہے.....

تم میرے سینے سے لگی ہو، اور نور کے ہالے میں تمہارا معصوم چہرہ ہے، اور مریم کا سا تقدس اور مسیح کا سا عجز تمہارے چہرے سے عیاں ہے، میں شادی کی بات کر رہا ہوں اور تم کہیں دُور چلی گئی ہو، برسوں مری آغوش میں رہنے کے باوجود مجھ سے ناآشنا ہو۔ جیسے تمہاری روح نے اپنے پر سمیٹ لئے ہیں اور مائلِ پرواز ہے، تم کون ہو؟ کہاں جانا چاہتی ہو...... اور میں کیوں آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں؟

سڑک پر اس گداگر لڑکی کی پھیلی ہوئی گندی باہیں جو آب میں سے اور بھی مٹیالی ہو گئی ہیں بھیک مانگتے ہوئے نظر آتی ہیں، یہ لڑکی ہمیشہ اسی ٹکڑ پر بیٹھتی ہے، اس کے قریب کی پٹڑی کا فرش ناہموار ہے، یہاں گڑھا نہیں، بلکہ کچھ ابھار سا ہے، جیسے یہ جگہ اپنے اندر کوڑے کرکٹ کی قبر کو چھپائے ہو، ایسا احساس ہوتا ہے۔ جیسے اس جگہ کے نیچے شہر بھر کا فاسد مادہ جمع ہے، ایک پکے ہوئے پھوڑے کی طرح۔ اور یہ لڑکی جو ہر روز یہاں بھیک مانگتی نظر آتی ہے، اس شہر کا فاسد مادّہ ہی تو ہے۔ اندھے سماج کا گندا پھوڑا۔ یہ میلی مٹیالی باہیں، یہ چندھیائی ہوئی آنکھیں، یہ خاک میں اٹے ہوئے رسّی کی طرح بٹے ہوئے بال .... "روشن جبیں، زلف عنبریں" ..... ناک کے نتھنوں میں مکھیاں گھسی ہوئیں، اور ان مکھیوں کی بھنبھناہٹ ایسی آواز نکالتے ہوئے کہہ رہی ہے۔ بھوکی ہوں، گریب ہوں۔ ایک پیسہ، یہ لڑکی جوان ہے؟ بوڑھی ہے؟ بچی ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا، جیسے زندگی اپنی ڈگر پر چلتے چلتے تھم گئی ہو حرکت کا احساس نہیں، بس تھم جانے کا احساس ہے، سمت کا اندازہ نہیں، صرف بھوک کی وسعت کا احساس ہے۔ اس کے چہرے پر دھاسے ہیں اور ہر روز یہی دھاسے یہی مکھیوں سے اٹے ہوئے نتھنے، یہی گندی پھیلی ہوئی باہیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ پیسہ ملے۔ نہ

ملے، یہ فٹ پاتھ کا ٹکڑا وہیں جوں کا توں موجود ہے۔

میں ہر روز اُسے دیکھتا ہوں، یہ بھی ہر روز مجھے دیکھتی ہے میں بھی اس شہر کا باشندہ ہوں، اس کا "مالک" ہوں، اِسے بھیک دیتا ہوں۔ اسے گالیاں دیتا ہوں، اس پر رحم کھاتا ہوں، مری خوشی کے لئے، مرے سکونِ قلب کے لئے یہ کس قدر ضروری ہے اگر یہ بھکارن نہ ہو۔ تو میں کس پر رحم کھاؤں، کسے ایک پیسہ دے کر اپنی فراخ دِلی کا ثبوت دوں۔ کس سے ہمدردی جتا کر اپنی برتری کا سکّہ جماؤں۔ کس کے درد کی دوا کر کے اپنی عاقبت سدھاروں۔ اس کا افلاس اس کی بے چارگی، اس کی زبوں حالی، اس کا فٹ پاتھ پر جاگنا، بیٹھنا، سونا، ہات پھیلا کر بین کرنا میری مسرت کے لئے میری زندگی کے لئے کس قدر ضروری ہے آہ خداوند میں ترا کس طرح شکر ادا کروں۔ تو اپنے بندوں کا کتنا خیال رکھتا ہے۔

لیکن اب یہ بھکارن چپ چاپ بیٹھی ہے۔ ہات نہیں پھیلا رکھے ہیں اور لب بھی وا نہیں، ان ہونٹوں سے بھیک مانگنے کی صدا نہیں آتی، مجھے مایوس نہ کر اللہ، مجھے مایوس نہ کر، بھیک مانگو اے بی بھکارن، بھیک مانگو تم نے اس سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بلّی کے بچّے کو اپنی چھاتی سے لپٹا لیا ہے، اسے پھینک دو، اچھی بھکارن اپنی میلی، ٹڈیالی باہوں سے اس خبیث کی گردن مروڑ دو۔ یہ خرخر

کرتا ہوا بلی کا بچہ تمہارے کردار کا دشمن ہے تمہارے پیشے کا دشمن ہے، میرے عیش و آرام کا دشمن ہے، اسے پھینک دو۔ اے فٹ پاتھ کی ساحرہ!

لیکن ساحرہ خود مسحور ہو گئی ہے، یقیناً یہ وہ بھکارن نہیں ہے جسے میں ہر روز اس نکڑ پر دیکھتا تھا۔ آج میں اس کی جگہ کسی اور ہی کو دیکھ رہا ہوں، کائنات کی ایک عجیب مخلوق، آنکھوں میں ایک عجیب چمک، ہونٹوں پر ایک عجیب تبسم، کلائیوں میں ایک عجیب گداز خم، اور چھاتی سے لپٹا ہوا وہ بلی کا بچہ، یقیناً یہ وہ بھکارن نہیں ہے۔ یہ وہ فٹ پاتھ نہیں ہے، یہ وہ شہر نہیں ہے، یہ وہ کائنات نہیں ہے۔ اس معصوم مامتا کے جذبے کو تو نے کہاں سے پالیا۔ میں آج تجھے پہلی بار دیکھ رہا ہوں اور تو مجھے پہچانتی نہیں، اے پھٹے ہوئے گریباں والی شہزادی، تو باؤلی پیارے بلی کے بچے کو چھاتی سے لگائے، دنیا و مافیہا سے بے نیاز اس نکڑ کے پتھروں کے تخت پر بیٹھی ہے، اور تیری پلکوں پر سات سمندروں کے موتی لرز رہے ہیں اور مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ آگے بڑھ کر تیری پلکوں سے ایک آنسو ہی چن سکوں، اور تو مجھے پہچانتی نہیں، یہ غیریت کیوں ہے کیوں تو نے اپنی خاک و خوں کی ننگی بھوکی دنیا میں اس شہد آگین جذبے کو پناہ دے کر مجھے بھکاری کر دیا، کیا تو اس بھکاری کو نہیں پہچانتی۔ جو ہر روز ہتھیلی پر ایک پیسہ رکھ کر تجھ سے مسرت کی بھیک مانگ لیا کرتا ہے

آج تو اُسے بھی نہیں پہچانتی۔ یہ کس نئی شخصیت کا پرتو ہے، جو تیری روح کی پہنائیوں میں کانپ رہا ہے! ......

سالہا سال اے رفیقِ جاں، اے میری محبوب، میں نے تجھ سے محبت کی ہے، اس میں وہ لمحات بھی شامل ہیں، جب وقت اور اَنا، اور حیات و ممات کی حدیں بھی مٹ گئی تھیں، اس گلی کے نکڑ کے مکان میں تجھے وہ دن بھی یاد ہوں گے، جب ہات کی ایک جنبش سے، پلکوں کے ایک اشارے سے، تبسم کی ایک لرزش سے سازِ ہستی کے تار ہم آہنگ ہو جاتے تھے، اور عشق کا نغمہ شعلے کی طرح بھڑک اُٹھتا تھا۔ ہم نے اس آگ کو بار بار چکھا ہے، اس آگ کے ذائقے میں، اس کی دوامی لذت میں کوئی فرق نہیں پایا۔ یہ شعلہ فروں تر ہے، یہ محبت جاوداں ہے، تو میری زندگی کا ماحصل ہے، میں تیری حیات کا مرکز ہوں، ایک ہی کشش ہے، ایک ہی محور ہے، ایک ہی شدت ہے، جیسے ساز کے مختلف تاروں سے ایک ہی نغمے کی تعمیر ہوتی ہے، جیسے چقماق کے دو ٹکروں سے ایک ہی شعلہ بلند ہوتا ہے، اسی طرح ہم نے اپنے دل، روح اور قالب کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک آہنگِ نو کی تخلیق کی ہے۔ کیونکہ جب جسم اور جان محبت کے

آتشکدے میں ملتے ہیں تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا، صرف آگ ہی آگ ....
شعلہ خدا ہے!

لیکن کیا تیرے دل میں اُس گھری "ابر آلود، خنک شام کی یاد باقی ہے جب ہم دونوں صوفے پر غالب کے دیوان کا مصور ایڈیشن دیکھ رہے تھے۔ اور نوکر نے ایک تار لا کر تیرے ہاتھوں میں دیا تھا۔ تار میں صرف اتنا لکھا تھا: "شیکھر عراق میں مارا گیا" رتن"۔ یہ شیکھر وہی تھا جو تجھ سے اس وقت سے محبت کرتا تھا کہ جب تو محبت کے جذبے کو پہچانتی بھی نہ تھی۔ اور جیسا کہ تو نے خود مجھے بتایا تھا کہ شیکھر نے ایک بار سفیدے کے درخت کے نیچے تیرے ہونٹوں کو چوما تھا، تیری زندگی کا پہلا انجان بوسہ، کیونکہ تو اس وقت اتنی ننھی سی تھی کہ بوسے کی کرب ناک لذت سے آگاہ بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر تو کیوں اُداس ہو گئی تو صوفے پر بیٹھی میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی، لیکن پھر بھی تو یکایک کہیں گم ہو گئی میری روح تجھے پکارتی رہ گئی اور تو بھٹر بھڑاتی۔ اس حلقے کو توڑ کر کہیں بھاگ گئی میری روح چلاتی رہی تھی اس نے تجھے لاکھوں آوازیں دیں۔ لیکن تو نے ایک نہ سُنی۔ شاید تیرے کان بہرے ہو چکے تھے، تیری زبان گنگ تیرا دل شاید کسی نئے پرانے جذبے کی شدت

سے معمور ہو گیا تھا، شاید تو اُس وقت عراق کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جا پہنچی تھی۔ جہاں ریت کے آتشیں بستر پر شبکھر مرا پڑا تھا، شاید تو اس رقت سفیدے کے اُس درخت کے نیچے کھڑی تھی، اور تیرے لب کسی انجان بوسے کی ان پہچانی ہوئی لذت کو پہچان رہے تھے، اس وقت میری باہیں نہیں، کسی غیر اجنبی نوجوان کی باہیں تری گردن میں حمائل تھیں تو اُس وقت میری آواز نہیں سن رہی تھی، بلکہ کسی دوسری روح کا اقرارِ محبت ترے لاشعور میں گونج رہا تھا۔ میں نے تیری آنکھوں میں آنسو چھلکتے دیکھے، ترے ہونٹوں کو کسی نئے جذبے کے زیر اثر کانپتے دیکھا، اور یکایک مجھ پر اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا، کہ میں تجھے نہیں پہچانتا، تو میری محبوب نہیں، اجنبی ہے۔ مجھ سے قطعاً بے گانہ ہے، اُس ہرنے والے لمحے کی خوفناک وسعت میں مجھے احساس ہوا کہ تو وہ عورت تھی جسے میں نے آج سے پہلے۔ اس لمحے سے پہلے، کبھی نہیں دیکھا۔ ... اس لمحے کی گہری کامل، کبھی نہ مٹنے والی اجنبیت ایک خونیں لکیر کی طرح میری روح پر اب تک کھنچی ہوئی ہے!

یہ میرا بچہ ہے، میرا اکلوتا بچہ، اس کی شکل و صورت، اس کی مسکراہٹ

اس کی تیوری کے تل سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ یہ مرے ارتقائے حیات کی دوسری منزل ہے، جس منزل کی تکمیل ہو چکی، وہ منزل اپنے کل ورثے کو لئے اس ننھے کے جسم و جان میں اتر آئی ہے، میں اسے پہچانتا ہوں، یہ مجھے پہچانتا ہے، گھنٹوں میری گود میں کھیلتا ہے۔ اکثر رات کو میرے سینے سے لگ کر سو جاتا ہے مجھے اس سے کہ دفتر میں بیٹھا بیٹھا میں اپنے تخیل میں اسے اپنی گود میں لے لیتا ہوں۔ یہ ہمک ہمک کر اچھلتا ہے، اور میں اس کی شرارتوں پر مسکراتا ہوں، ہنس پڑتا ہوں، میرے ساتھی کلرک میری ان عجیب حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ میری طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں، اور اکثر بے اختیار ہو کر قہقہے لگاتے ہیں۔ جاہل! وہ کیا جانیں کہ میں اپنے اکلوتے بچّے سے کھیلنے میں مصروف ہوں! . . . . اور شام کو جب میں تھکا ماندہ دفتر سے گھر کی جانب قدم بڑھاتا ہوں تو اس کی موہنی صورت ہر لحظہ آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ قریب ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ میں گھر کے دروازے پر پہنچ جاتا ہوں، اور اسے دروازے پر انتظار کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اور وہ خوشی سے چلّاتا ہوا۔ تالیاں بجاتا ہوا، چچا آ دیئے۔ "چچا آ دیئے" کہتا ہوا میری ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے، اور میں اسے اٹھا کر زور سے اپنے سینے سے لپٹا لیتا ہوں، ہاں، تو تو سچ مچ میری روح کا حصّہ ہے،

میرے قالب کا ٹکڑا ہے، میرے جگر کا گوشہ ہے !!!

ایک دن جب میں دفتر سے واپس آیا تو دیکھتا ہوں کہ وہ پتھر کے چند نیلے پیلے ٹکڑوں سے کھیل رہا ہے، میں نے اُسے آواز دی، لیکن وہ کھیلنے میں اس قدر منہمک تھا کہ اس نے میری آواز نہیں سُنی مجھے دیکھا تک نہیں، ہنستے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے، پتھروں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے، وہ اُن سے کھیلتا رہا۔ میں نے پھر زور سے آواز دی، وہ چونکا۔ ہماری نگاہیں ملیں، اور میں بھی جیسے چونک گیا، ایک لمحے کے لئے، صرف ایک لمحے کے لئے اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کسی اجنبی کو دیکھ رہا ہو، میں کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کہ اس ایک لمحے میں میں اپنے بچے کے لئے قطعاً اجنبی تھا۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ ان پتھر کے ٹکڑوں کو پہچانتا تھا، جن کے ساتھ وہ ابھی کھیل رہا تھا۔ وہ اس اجنبی سے خائف بھی نظر آتا تھا، اور ایسی ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جو یوں بن بلائے اس کی دنیا میں آگیا تھا۔ جہاں نیلے پیلے خوبصورت پتھروں کے ٹکڑے، اُس کے دوست اور ہمراز اُس کے ساتھ کھیل رہے تھے ...... آہ، وہ اذیت ناک لمحہ، میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا، ہم دونوں اجنبی تھے، اور زندگی کے خاموش ساحل پر کھڑے ایک دوسرے کو حیرت سے تک رہے تھے۔ تو کون ہے۔

اے اجنبی یہاں کیوں کھڑا ہے، جا مجھے اپنے دوستوں سے کھیلنے دے؟.... اے ننھے بچے تو کون ہے، تو کہاں سے آیا ہے۔ میرے گھر کے دروازے پر پتھر کے ان رنگین ٹکڑوں سے کیوں کھیل رہا ہے....... اس ایک لمحے میں جو مجھے کائنات کی طرح بسیط معلوم ہوا۔ اک خوفناک غیریت کا احساس ہم دونوں پر چھا گیا، اور باپ اور بیٹا دونوں اجنبی تھے، خاموش کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہ گئے۔

اور یکایک میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہوں، زندگی اور موت، محبت اور فطرت، حسن اور عشق کی حدوں کو چیرتی ہوئی یہ عریاں حقیقت مجھ تک آئی کہ تو اکیلا ہے، زندگی کے ٹکڑوں پر اجنبی کی طرح کھڑا ہے، اور تجھے کوئی نہیں پہچانتا، اور میں نے بے اختیار ہو کر دونوں ہات پھیلا دیئے اور چلّا کر کہا۔ کیوں؟ کیوں؟ اے مرے ننھے بیٹے!...... اے گٹر کی شہزادی بھکارن.... ..اے طوائف ملکہ . . اے میری دمساز و غم گسار محبوب، بتا دے یہ پردہ کیسا ہے؟ یہ دیوار کیسی ہے؟ یہ احساسِ اجنبیت کیوں ہے؟.....

۱۵

نغمے کی موت

ساگرہ کے بوڑھے نمبردار نے بارہ سال تک مرحوم کے لڑکے کی پرورش کی۔ اس نے بجمالِ مہربانی لڑکے کا نام گلاب رائے رکھا۔ لیکن اگر وہ اس کا نام مہو، چندرو، بیدرو، یا گھاسی رام رکھ دیتا۔ تو اسے منع کرنے والا کون تھا۔ یہ تو اس کے شریف الطبع ہونے کی بہترین دلیل تھی کہ اس نے ایک یتیم لڑکے کی بارہ سال تک پرورش کی اور اس کا نام گلاب رائے رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ لڑکا گلاب کی طرح خوش رنگ اور حسین تھا۔ اور اس کے چہرے اور ہاتھ کی آنگلیوں میں اپنی ماں کے جمالی حسن کے بہت سے اوصاف پائے جاتے تھے۔ لیکن جیسا کہ دنیا کے ہر ایک ادیب اور شاعر نے کہا ہے کہ حسین چہرے

عورتوں کو ہی زیب دیتے ہیں یا اُن امیر نوجوانوں کو جنہیں زلیخاؤں کے عشق میں مرنے کے لئے ہزاروں موقعے ملتے ہوں۔ وقت بھی ہو اور وافر پیسہ بھی ہو۔ لیکن گلاب رائے تو ایک یتیم لڑکا تھا۔ ایک غریب کسان کا بچہ۔ جس کی حیثیت گاؤں میں بوڑھے نمبردار کے ایک کمین سے بڑھ کر نہ تھی۔ غریب عورت میں خوبصورتی ہو تو بازاروں میں بک جاتی ہے۔ وہ ایک نفع دینے والی شئے ہے۔ لیکن غریبوں کے بیٹوں میں خوبصورتی ایک بیکار شے ہے، بلکہ اکثر مضرت رساں بھی۔ کیونکہ بازار میں تو کسان بچوں کے بازوؤں کی طاقت اور چھاتی کا زور بکتا ہے۔ اور جن کے پاس یہ دونوں چیزیں کم ہوتی ہیں، یا کم ہو جاتی ہیں اُنہیں پیٹ بھر کر روٹی نہیں مل سکتی۔ یہ سماج کا ایک سیدھا سادھا اصول ہے جس پر غور کرنے کی چنداں ضرورت نہیں اور یہ تو گلاب رائے کی خوش قسمتی تھی۔ کہ اس کے کردار میں نسائیت کی جھلک نمایاں ہونے کے باوجود اسے دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی تھی۔

پہلے پہل جو کام اسے بوڑھے نمبردار نے سپرد کیا تھا۔ وہ چنداں مشکل بھی نہ تھا۔ اور اب جب گلاب رائے کبھی ان دنوں کو یاد کرتا۔ تو وہ اسے اپنی ماضی کے حسین ترین لمحے معلوم ہوتے وہ دن کو بوڑھے نمبردار کا ریوڑ سرکاری رکھ

میں لے جاتا تھا۔ جہاں گائیں بھینسیں اور بھیڑ بکریاں چرانا ایک بہت بڑا
جرم تھا۔ لیکن ساگرہ اور دیگر پہاڑی مواضع میں جو پہاڑوں کی ڈھلانوں پر آباد
تھے۔ اور جہاں رہیں نی کس اس قدر کم تھی کہ سال کی فصل ضرورتِ زندگی کی
کفیل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہاں مویشیوں کے لئے کسان لوگ اپنے کھیتوں میں
سے چراگاہیں کیسے بنا سکتے تھے۔ سرکاری رکھیں بھی ریوڑوں کے لئے بند تھیں
اس لئے محض حالات سے مجبور ہوکر وہ سرکاری قانون کی خلاف ورزی کرتے
رہتے تھے۔ ورنہ ان میں کسی شیطانی قوت یا گناہ کرنے کی نوبت کا دخل نہ تھا۔
گلاب رائے بوڑھے نمبردار کا ریوڑ دل بھر رکھ میں چراتا تھا۔ خوبصورت دیواروں
کے نیچے پلی ہوئی ہری ہری پتلی گھاس دودھ دینے والے چوپایوں کے لئے
بہت عمدہ تھی اور کہیں کہیں ان دیواروں کے جھناروں تلے چھوٹے چھوٹے
قدرتی مرغزار بن گئے تھے۔ جہاں گاؤں کے چرواہے اور چرواہیاں اکھٹے
ہوکر کھیلا کرتے تھے۔ چھ سال سے پندرہ سولہ سال تک کے لڑکے اور لڑکیاں
اسی قدرتی مکتب میں تعلیم پاتے تھے۔ وہ درختوں پر بندروں کی طرح چڑھنا سیکھ
جاتے۔ اخروٹوں سے نشانہ لگاتے، گیدڑ، سور، خرگوش اور دیگر جنگلی جانوروں
کے لئے زمین میں ایسے خوفناک ڈربے تیار کرتے کہ جہاں کہیں کسی درندے

نے ڈربے پر پاؤں رکھا۔ وہیں ڈربے میں اسکی ٹانگ اُلجھ کر رہ جاتی تھی۔ پھر وہ ہزار
جھٹرائے لیکن ڈربہ اسے کہاں چھوڑ سکتا تھا۔ دوسرے دن سب آکر اپنے
شکار کو ڈربے میں پھنسے دیکھ کر خوش ہوتے۔ موذی جانوروں یعنی گیدڑ
اور سُور تو فوراً ہلاک کر دئے جاتے تھے کیونکہ وہ فصلوں کو نقصان
پہنچاتے ہیں اور پیارے پیارے خرگوش چرواہوں کیلئے دلچسپ کھیل بن جاتے
لیکن گلاب کو ڈربے بناتے میں مزہ نہ آتا تھا۔ ہاں اپنی کوشش سے آہستہ آہستہ
ریوڑوں کی تنظیم و ترتیب سے خوب واقف ہوگیا تھا۔ انہیں اکٹھا کرنے
اور جنگل میں منتشر کر دینے اور خطرے کے وقت پھر وہ سب کو جمع کر لینے کی ترکیبوں
سے اب بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ بانسری اور الغوزہ بجانے میں بھی وہ ماہر ہوگیا
تھا۔ دوپہر کے وقت جب سورج کی کرنیں چیڑ کے لاتعداد درختوں کے ہلتے
سایوں میں سے سبز گھانس پر ایک دلفریب شطرنج بُن دیتیں، اور ریوڑ کی آنکھیں
نیند کے بار سے بند ہو جاتیں، چرواہے اور چرواہیاں اپنے مختلف کھیلوں سے تنگ
آگئے ہوتے۔ اس وقت گلاب کی بنسری کا سنہری نغمہ نیند کے ماتوں کو ایک میٹھی مدہوشی
کے روپہلی مرغزاروں میں لے جاتا۔ نوجوان چرواہیوں کی نگاہیں، فضا میں
انکے گلے مرمریں بُرج تراشنے لگتیں۔ اور چرواہے کنکھیوں سے

اپنی اپنی محبوب چرواہیوں کی طرف تکتے۔ اس وقت چرواہیوں کے سخت اور کھُردرے ہاتھ انہیں ریشم کی طرح ملائم اور صاف معلوم ہوتے گلے میں پڑی ہوئی چاندی کی ہنسلی شعلے کی طرح تڑپنے لگتی۔ آنکھوں میں محبت کی ملائمت اور تمتماتے ہوئے سُرخ رخساروں پر شرم کی نمی آجاتی۔ پریشان اور عطر و تیل سے ناآشنا بالوں کا ہر پیچ ایک سنہری حلقہ بن جاتا۔ لڑکپن اور جوانی کے درمیانی وقفے کی الفت میں شباب کی سی اہلیت جیسی، اور پختہ کاری تو نہیں تھی۔ لیکن اس کی کمی کو ایک اطہر، معصوم شعریت پورا کر دیتی۔ اس کے لطف کے بہاؤ میں ہر نوجوان چرواہے اور چرواہی کا دل ہچکولے لینے لگتا۔ زندگی کا ہر تار مرتعش ہو جاتا اور گلاب کی بنسری کی دھیمی لے کے ساتھ کسی چرواہے کی آواز جنگل کو اپنی میٹھی اُداسی سے بھر دیتی۔

اس طرح میٹھے نغموں اور نیند کی ہلکی ہلکی مدہوشیوں کے درمیان جہاں حقیقت اور خواب کی حدیں مل جاتی تھیں، دوپہر گذر جاتی، اور دیوڑ پھر چرنے لگتا۔ چرواہے انگڑائیاں لے کر اٹھتے اور چوپایوں کی پیٹھ پر ہلکے ہلکے سونٹے مار کر ان کی پیٹھ کو سہلاتے اور اپنی مدہوشی کو دُور کرتے پھر کسی چشمے کے کنارے چلے جاتے۔ جس کے عکس میں چرواہیاں اپنے چہرے صاف کرتیں، ہاتھ اور پاؤں

دھوتیں۔ اور اکثر جھک کر وہ چند لمحوں کے لئے اپنا چہرہ چشمے کے صاف پانی میں
چھپا کر اپنی آنکھیں کھول دیتیں۔ تو انہیں ایک عجیب و با لطر آنی چشمے کی تہ میں ہر
کنکر ایک ہیرے اور جواہرات سارا شاہوا محل معلوم دیتا۔ مینڈکوں کے جسم بھیل
کر خوفناک دیوبن جاتے۔ پانی میں اُگی ہوئی گھاس ایک سبز جنگل کی صورت
اختیار کر لیتے اور سورج کے ترزاتے ہوئے حلقے سنہری اور رو پہلے میدان بنجانے
جہاں پانی کی پریاں سب انسانوں کی نگاہوں سے بچ کر ناچا کرتی تھیں جرواہے
چشمے سے نکلتے ہوئے چھوٹے نالے میں بیٹھ جاتے اور گھاس کی سمت نیلمان چین
کر ان کی پن چکی بناتے اور نالے کے ایک ننھے سے آبشار کے منہ پر اسے
لگا دیتے گھاس کی بنی ہوئی پن چکی روز دور سے چکر لیتی ہوئی چلتی تھی اور چرواہے
اسے دیکھ دیکھتے تھے۔ اور اپنے انجینئری کے کمال پر خوش ہوتے تھے۔ اسی
طرح ٹیلوں میں سہ پہر گذر جاتی اور جب سورج جنوب مغربی سلسلہ ہائے کوہ
کے پرے جانے لگتا۔ تو چوپایوں کے گلوں میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ
چرواہے واپس گاؤں میں آجاتے۔ اور گلابو کی دلکش زندگی ختم ہو جاتی اب
اسے بوڑھے نمبردار کی گایوں اور بھینسوں کو دوہنا ہوتا جانوروں کے لئے چارہ اور
ان کے لئے دانہ مولیشی خانہ میں الاؤ تیار کرنا ہوتا۔ وہ الاؤ جس میں آگ کم اور

دھواں زیادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ دھوئیں میں مچھر اور مکھیاں جانوروں کو کم ستاتی ہیں۔ رات کو آسے دو مکّی کی موٹی روٹیاں اور آل کا سالن مل جاتا۔ یا گنہار کی کڑھی اور چانول اور کرم کا اُبلا ہوا ساگ۔ ست نرائن گو گاؤں کا نمبردار تھا۔ لیکن اس کے یہاں بھی وہی کچھ پکتا تھا۔ جو گاؤں کے غریب سے غریب برہمن کے ہاں۔ اِس لئے خوراک کے معاملے میں گلاب بھی گاؤں کے دوسرے افراد سے زیادہ بدقسمت نہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ ست نرائن کی بیوی اکثر سالن پکاتے پکاتے اور سالن میں نمک ڈالنے سے پہلے گلاب کے لئے سالن نکال لیا کرتی تھی، کیونکہ گاؤں میں نمک کپڑے سے بھی مہنگا تھا۔ نمک اور گُڑ، اس لئے گلاب کا سالن اکثر بے نمک ہوتا تھا اور مکھن کے بغیر، روٹیاں اکثر آن چپڑی اور باسی ہوتی تھیں۔ اور جب کبھی گھر میں گُڑ کے میٹھے چاول پکتے تھے اور ان کی سہانی خوشبو لڑکوں کو بے تاب کر دیتی، تو اکثر گلاب کا حصّہ بھی وہی کھا جاتے تھے۔ اور گلاب کی بے تابی غم و غصّہ میں تبدیل ہو جاتی اور وہ منہ پھلائے مویشی خانے میں جاکر سو جاتا تھا۔ کیونکہ وہ نمبردار کے مویشی خانے کا چوکیدار تھا۔ مویشی خانے میں چوپاؤں کے جسموں کی کثیف بُو، پیشاب کا ابو نیا، اور الاؤ کا گندہ اور تیز دھواں اسے پہلے پہل بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں، جسم پر خارش نکل آئی تھی۔ اور وہ کئی مہینے کھانستا رہا تھا لیکن

اب وہ ان چیزوں کا عادی ہو گیا تھا۔ خارش تو اب بھی اسے سردیوں میں نکل آتی تھی۔ لیکن اسے کھٹمل اور پسّو اب نہ ستاتے تھے۔ اس کے جسم کی نسائیت دُور ہو رہی تھی، اس کے ہاتھوں کی لمبی اور مخروط انگلیاں جو شاید کسی مصوّر یا عورت کی ہوتیں تو بہتر ہوتا، اب جسمانی کثرت سے سخت اور کھردری ہو گئیں تھیں، اس کے پاؤں میں بیائیاں پھوٹ آئی تھیں، اور سردیوں میں اکثر یہ بیائیاں بہت بڑھ جاتیں۔ اور جب سانگرہ کی وادی میں برف جم جاتی تو اسے مویشی خانے سے چوکھر نکالنے اور برف پر چلنے میں بہت دقت ہوتی۔ کبھی کبھی ان بیائیوں سے خون رِس کر بہنے لگتا۔ اور اس کے پاؤں سوج کر بھاری ہو جاتے اور وہ شدت درد سے چلا اٹھتا اس نے کئی دفعہ ست نرائن کی بیوی سے کہا تھا کہ وہ اُسے پاؤں کے جوتے بنوا دے لیکن ست نرائن کی بیوی ہمیشہ یہ کہہ کر اُسے ٹال دیتی تھی، کہ بیٹیا اگلے سال ضرور بنوا دوں گی۔ گلاب ست نرائن کی بیوی کو ماں کہا کرتا تھا، گو اُسے پتہ تھا کہ اس کی حقیقی ماں کون تھی۔ اور کن حالات میں گاؤں سے نکل بھاگی تھی۔ اور کس طرح اس نے گاؤں والوں کے کہنے کے مطابق ایک دُور کے گاؤں میں خودکشی کر لی تھی، اسے ان سب باتوں کا پتہ تھا۔ اور کئی دفعہ چرواہے اور چرواہیوں نے اسے تنگ کرنے کی خاطر یہ باتیں جا کر اس کے سامنے دُھرائی تھیں۔ اور دُرگا جسے

وہ اس قدر پیار کرتا تھا۔ اور جس کے لئے وہ اپنی جان تک دینے کو تیار تھا۔ اسے حاصل کر بہت چڑاتی تھی اور یہ باتیں سنتا سنتا، وہ اپنا چہرہ اپنی میلی قمیص میں چھپا کر رونے لگتا تھا۔ اسے رونا بہت آتا تھا، وہ ذراسی تکلیف پر رو دیتا۔ اور ذراسی بات پر ہنس دیتا اور چڑواہوں کو اسے رلانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ لیکن ست نرائن کی بیوی تو سچ مچ اسے رلانا نہیں چاہتی تھی، وہ آخر ایک عورت تھی اور جمنا کے ساتھ نفرت ہوتے ہوئے بھی اسے جمنا کے ساتھ ہمدردی تھی، وہ اس کے بیٹے کو چمڑے کے جوتے سوا دیتی، لیکن وہ کیا کرے۔ خود اس کے اپنے بیٹا بیٹیوں کے پاس چمڑے کے جوتے نہیں ہوتے تھے کبھی ایک کے پھٹ جانے اور کبھی دوسرے کے۔ اور اکثر انہیں گھاس کی پول پہننی پڑتی تھی، بلکہ گاؤں کے اکثر افراد تو دھان کے خشک پودوں کو بن کر پولیں تیار کر لیتے تھے۔ اور انہیں کو اپنے پاؤں میں پہنتے تھے۔ یہ پولیں چمڑے کے جوتوں سے بدرجہا بہتر ہوتیں۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی اور جسمانی آرام کے خیال سے بھی کیونکہ چمڑے کے جوتے تو برف پر فوراً پھسل جاتے تھے۔ لیکن یہ دھان کے خشک پودوں سے تیار کی ہوئی پولیں کبھی دھوکا نہیں دیتی تھیں۔ یہ بات سچ ہے کہ ان پولوں سے سردی سے بچاؤ نہیں ہو سکتا۔ اور پاؤں اکثر نیلے ہو جاتے

تھے اور بیائیوں سے خون بہنے لگتا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے چمڑہ بہت مہنگا تھا اور موچی عوضانہ بہت مانگتے تھے۔ اور یوں بھی تو گائے اور بھینسوں کے جسموں سے بنے ہوئے جوتے برہمنوں کے پاؤں کو زیب نہیں دیتے تھے۔ اسی لئے تو گلاب کے لئے چمڑے کے جوتے کبھی نہ بن سکے تھے۔

وہ یخ بستہ سردی میں رات کو مویشی خانہ کا تنگ دروازہ بھی بند کر دیتا۔ اور الاؤ کے دہکتے ہوئے کوئلوں میں اپنے سر دپیر ڈال دیتا۔ پیر اس قدر سُن ہو چکے تھے کہ بہت لمحے گزر جانے کے بعد ہی ان میں زندگی کی حرارت عود کرتی اور اسے انگاروں کی گرمی کا احساس ہوتا۔ وہ بہت دیر تک اپنے پاؤں الاؤ میں سینکتا اور جب پاؤں اور جسم خوب گرم ہو جاتے تو اپنا دُہرا کمبل اوڑھ کر چارپائی پر دراز ہو جاتا اکثر راتوں کو اُسے دُرگا کی صورت بہت تنگ کرتی تھی۔ اور مویشی خانہ کی پھیلی ہوئی کثیف دُھند میں کہ جس میں گندہ بیروزہ کی سی بدبُو ہوتی تھی، وہ اپنے تیز تخیل کی مدد سے دُرگا کا شوخ چہرہ جس کے داہنے گال میں ہنستے وقت ایک دلفریب ڈمپل پڑتا تھا، ایک واضح صورت میں گھڑ لیتا تھا، دُرگا اُسے بہت ستاتی تھی۔ اکثر اُسے گالیاں بھی دیتی تھی اور اس کی ماں کا قصّہ دہرایا کرتی تھی اور اسے بار بار رُلایا کرتی تھی، لیکن اب رُو رُو کر گلاب کا رونا بہت کم ہو گیا تھا مشقت

کرتے کرتے اس کے جسم کی نسائیت دُور ہو چکی تھی، صرف اس کے چہرے پر
اور اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں کسی سنہری اور اداس خواب کا ہلکا سایہ تو
باقی رہ گیا تھا۔ اور جب گلاب کا دل بہت رنجور ہو جاتا تو وہ اسی اداس خواب
کو اپنی بنسری کے نغمے میں ڈھال لیتا تھا پھر رات کی تنہائیوں میں وہ کبھی مویشی
خانے کے کواڑ کھول دیتا اور اس کی دہلیز پر بیٹھ کر اپنی سوئی ہوئی بنسری کو جگاتا اس
کے سانس کی لطافت سے بنسری حرکت میں آجاتی اور اس کے لحے زیادہ
گہرے ہو جاتے، ان کی سسک اور تڑپ اور دل کا دُکھ بڑھ جاتا۔ مدھم نغمے کے
ناچتے ہوئے تال پر گاؤں کی کنواریوں کا دِل تیزی سے حرکت کرنے لگتا اور
بوڑھی عورتوں کو کرشن مراری یاد آجاتے، ایک دن بوڑھے نمبردار کی بیوی
نے جسے وہ ماں کہا کرتا تھا اس سے کہا، "بیٹا! تم رات کو ایسی بنسی نہ بجایا کرو!"

"کیوں ماں ؟"

"بیٹا میرا دل دکھتا ہے۔ میں کل رات کو مالا پھیر رہی تھی۔ کہ میں نے
تمہاری بنسی سُنی۔ اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ میں نے سوچا کہ
گوکل میں گوپیوں کے درمیان کرشن مراری اسی طرح بنسی بجاتے ہوں گے
بیٹا تم یہ بنسی نہ بجایا کرو۔"

لیکن اکثر راتوں میں بنسی کا یہ نغمہ درگا کے دل کو بھی بیتاب کر دیتا تھا۔ اور یہ جان کر کہ ان نغموں کا محبوب کون ہے، اس کے دل میں ایک نامعلوم سی خوشی گدگدی لیتی۔ بستر پر لیٹے لیٹے اس کا سارا جسم ٹوٹنے لگتا۔ اسے اپنے گالوں پر ایک شعلہ سا جلتا ہوا محسوس ہوتا اور شعلے کی لپک اس کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ اور وہ چاہتی کہ کوئی اسے اپنے طاقتور بازوؤں میں لے لے اور بھینچ بھینچ کر اسے اپنے گلے سے لگا لے . . . کہ اس کا سانس بند ہونے لگے لیکن صبح ہوتے ہی اپنے اس احساس پر شرمندگی اور ندامت سی محسوس ہوتی، اور جب وہ جنگل میں گلاب سے ملتی تو اس سے ایسی درشتی اور سخت کلامی سے پیش آتی۔ کہ بیچارے لڑکے کا رنگ متغیر ہو جاتا اور وہ مرعوب ہو کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اور چرواہے اس کی حالت کو دیکھ کر ہنستے اور قہقہہ لگاتے لیکن جب گلاب اپنے تخیّل میں درگا کو بلا لیتا تھا۔ تو درگا ایک مہربان دیوی کی طرح اس کے پاس آجاتی تھی، لمبی، پتلی اور خوبصورت سنج کی شاخ کی طرح۔ پھر گلاب کو وہی لمحے یاد آتے۔ جب سچ مچ درگا نے اسے پیار کرنے کا موقعہ دیا تھا۔ ایک بار جب درگا نے سر درد کی شکایت کی تھی۔ اور وہ اس کا سر اپنی رانوں پر رکھ کر دو گھڑی دباتا رہا تھا۔ ایک بار جب اس نے بنفشہ کے پھولوں کا گچھا اس کے بالوں میں

ٹانک دیا تھا۔ اور اس کی ٹھوڑی اٹھا کر اور اس کے دونوں رخسار اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا منہ چوم لیا تھا۔ اور درگا کی محبت آمیز خوشی نے اس کے دل کو خوشی سے بھر دیا تھا۔ ایک بار اونچے اونچے دلوروں کے تنوں کے نیچے اُگی ہوئی گھاس کی جھاڑیوں کے درمیان جب وہ گرچ کے سُرخ سُرخ پھل کھا رہے تھے دُرگا نے یکا یک ہاتھ بڑھا کر گرچ کے سُرخ دانے اس کے منہ میں ڈال دیئے تھے۔ اور گلاب نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اور پھر وہ دیر تک اسی طرح ایک دوسرے کو توڑ توڑ پھل کھلا رہے تھے ... لیکن ایسے لمحے گلاب کے لڑکپن میں بہت کم آئے تھے۔ اور اب ان لمحوں کی شیرینی اور خوبصورتی کی یاد اس کے دل میں ٹیس سی پیدا کر دیتی تھی۔

اور پھر گلاب کو موسمِ خزاں کی وہ شام یاد آئی۔ کہ جب نالے میں پانی چڑھا ہوا تھا۔ اور وہ اور دیگر چرواہے جنوب مغربی پہاڑوں کے جنگلوں سے اپنے ریوڑوں کو چرا کر واپس گاؤں کو لا رہے تھے۔ اس نے درگا کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا تھا اور نالے میں سے گزر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک لکڑی کے سہارے چل رہا تھا۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور درگا اسے چھیڑنے کے لئے آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔ اور ہنس رہی تھی۔

نالے کے درمیان جہاں پانی بہت زوروں پر تھا، گلاب یکایک کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا۔ شریر لڑکی! اب میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں یہیں پانی میں گرادوں کیوں؟ کیسا مزا رہے گا۔ دُرگا نے فوراً ایک چیخ مار کر گانا بند کر دیا۔ اور زور سے اُس کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور اپنی ٹانگیں زور سے اس کی چھاتی سے لگالیں۔

گلاب اپنی چالاکی پر بہت خوش ہوا وہ اسی لمحہ کو زیادہ لمبا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کم بخت پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ اسے پانی کے ٹھنڈا ہونے کا احساس تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنے گلے میں حمائل بازوؤں کی نرمی اور گرمی اور اس کی چھاتی پر لٹکتی ہوئی لاتوں کے حسین تناسب اور ان نازک ٹخنوں کی گولائیوں کا بھی احساس تھا۔

لیکن پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ وہ آگے چلنے پر مجبور ہو گیا۔ اور دُرگا نے پھر گانا شروع کر دیا۔

راستے میں گلاب پھر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔

"ایک بات کہوں۔ اگر تم بھی سچ سچ کہو؟"

"کہو، میں بھی سچ سچ کہوں گی۔"

"تمہیں شیو جی کی قسم!"

"ہاں مجھے شیو جی مہاراج کی قسم!"

"کیا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟"

کچھ عرصہ گلاب خاموشی سے پانی میں کھڑا رہا۔ پھر درگا بولی۔ نہایت سنجیدہ لہجے میں اب تم نے جو من کی بات پوچھی ہے، تو میں بھی سچ سچ کہوں گی۔ تم مجھے اچھے تو لگتے ہو، لیکن اتنے اچھے تو نہیں کہ میں تمہارے ساتھ بھاگ جاؤں۔ اور پھر شادی تو ماں باپ کے بس میں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہاری میری شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ ایک تو تمہاری ماں کا قصبہ ہے اور پھر ... برا نہ ماننا ... تمہارے پاس نہ زمین ہے نہ زیور، نہ مکان ... کچھ بھی تو نہیں ... برا نہ ماننا گلاب ...... تم نے من کی بات پوچھی تھی۔

گلاب یکایک آسمان سے زمین پر اتر آیا۔ اسے ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔ وہ کوئی بات نہ کہہ سکا۔ اور سچ مچ درگا کی باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پانی میں چلتے چلتے اسے محسوس ہوا۔ کہ اس کی ٹانگیں بے جان ہو گئی ہیں۔ اور وہ خود بھی ایک بے جان لوتھ کو کندھوں

پر اُٹھائے ہوئے گزر رہا ہے۔

پھر کنارہ آگیا۔ اور دُرگا فوراً ہی اس کے کندھوں سے اُتر پڑی۔ اور وہ ایک دوسرے سے آنکھیں نہ ملا سکے۔

رات کو مویشی خانے کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی بنسری کو کئی اُٹھایا لیکن وہ اسے لبوں تک نہ لے جا سکا۔ اور اُسے احساس ہوا کہ اب اس بنسری میں کوئی نغمہ ہی باقی نہیں ہے۔

پنڈارے

جنا ساگرہ میں رہتی تھی۔ ساگرہ برہمنوں کا گاؤں تھا اور ہزاروں برسوں سے چلا آتا تھا۔ ستبر کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے کہساروں میں یہ بھی ایک چھوٹے سے کہسار میں واقع تھا۔ اس کے حدود اربعہ میں صرف دو طرفیں پائی جاتی تھیں، شمال مشرق اور جنوب مشرق۔ دونوں اطراف میں اونچے اونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ جو ایک تنگ بیضوی دائرہ بناتے ہوئے پھر آپس میں آ مل گئے تھے۔ سورج ہر روز ایک پہاڑ سے نکلتا اور دوسرے پہاڑ میں غروب ہو جاتا۔ کہسار کے اوپر اس تنگ بیضوی آسمان میں سورج کی حرکت ایک چھوٹی سی آڑی لکیر تھی۔ اور یہ آڑی لکیر ہمیشہ بدلتی رہتی۔ ساگرہ کے برہمن اس آڑی لکیر کو دیکھ کر موسم کی تبدیلیں

کا اندازہ لگایا کرتے۔ گرمیوں میں اس آڑی لکیر کا پہلا سرا بالکل پہاڑی نالے کے منہ پر چلا جاتا تھا۔ اور دوسرا اس نقطے پر جہاں پہاڑی نالہ دونوں پہاڑوں کی سمٹی ہوئی حدوں کے بیچ میں سے گزرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان دنوں مکی کی فصل بوئی جاتی تھی۔ اور مکی کے کھیتوں کے کنارے کنارے کرم کا ساگ اور مرچوں کے پودے۔ نالے کے کنارے کھیتوں میں پانی ہمیشہ کھڑا رہتا تھا۔ اس لئے یہاں دھان بویا جاتا تھا کبھی کبھی نالے میں بارش کا پانی بہت زوروں پر آجاتا تھا۔ اور دھان کا ایک آدھ کھیت بہہ جاتا تھا۔ لیکن جب سردیوں میں نالہ سکڑتا ہوا جنوب مغربی پہاڑ کے پاؤں سے جا لگتا تھا۔ اس وقت ساگرہ کے براہمن نالے سے اپنا کھیت واپس لے لیتے تھے۔ اور اگلے سال کے دھان کے لئے ایک آدھ کیاری اور بھی بنا لیتے تھے۔ اس طرح کرتے کرتے انہوں نے قریباً قریباً پہاڑی نالے کو مجبور کر دیا تھا۔ کہ وہ ہمیشہ جنوب مغربی پہاڑ کے پاؤں سے لگ کر بہا کرے قریباً قریباً اس لئے کہ ساگرہ کا نالہ کبھی کبھی موقع پاکر براہمنوں کے حکم کی خلاف ورزی کر دیا کرتا تھا۔ اور براہمن اسے کوئی سزا نہ دے سکتے تھے۔

ساگرہ میں دن کم آتے تھے اور راتیں زیادہ۔ اجلی روشنی اور چمکتی ہوئی

دھوپ کم ہی آتی دن کو اکثر ایک ملگجی سی سفیدی چھائی رہتی۔ اور رات کو گہری سیاہی جس میں کہیں کہیں تارے جلتے ہوئے انگاروں کی طرح سلگتے اور سردیاں تو اکثر ایک لمبی رات ہوتی تھیں۔ جس میں بادل گھرے رہتے۔ برفیلی ہوائیں چلتیں۔ اور کبھی کبھی بجلی کوند کوند جاتی۔ ساگرہ کی دو طرفیں تھیں۔ اور دو ہی موسم گرمی اور سردی۔ یا ایک چھوٹی سی بہار اور ایک لمبی سی خزاں۔ اور فصلیں بھی دو ہی تھیں مکئی اور دھان لمبی سی خزاں میں تو ساگرہ کے براہمن پردیس میں نوکری کی تلاش میں چلے جاتے۔ جہاں وہ اکثر باورچی رکھ لئے جاتے۔ یا کسی دور دراز کی منڈی سے نمک لانے کے لئے روانہ ہو جاتے۔ یا گھر پر بیٹھ کر سوت اور کپڑا بناتے عورتیں صلیب نما چرخوں پر گھوں گھوں کے ساتھ گا گا کر سوت کی انٹیاں اور مرد کچے گھروں کے لیپے ہوئے آنگنوں میں لکڑی کی کیلیں ٹھونک کر سوت کے تانے بانے سے اپنی پوشش کے لئے کپڑا تیار کرتے، روئی چادریں، لوئیاں، لحاف، موٹا کھدر اور اپنی نوجوان، بہوؤں، بہنوں، اور بیویوں کے لئے سوت اور اون کو ملا کر ایک عمدہ پتلا سا کپڑا تیار کرتے جس پر عورتیں سرخ تاگے سے بھدے اور بدنما پھول کاڑھ لیتیں۔

ساگرہ کے گاؤں میں بمشکل ایک سو گھر ہوں گے۔ ان ایک سو گھروں کی

حکومت گاؤں کے سب سے بڑے بوڑھے براہمن کے سپرد تھی۔ وہ گاؤں کا نمبردار بھی تھا۔ اور مذہبی پیشوا بھی۔ اور گاؤں سے باہر بڑی سرکار کے سامنے گاؤں والوں کی نیکی بدی کا ذمہ دار اور ان کا مستقل نمائندہ اس گاؤں میں تو ہمیشہ ہزاروں سالوں سے بڑے بوڑھے براہمن مذہبی پیشوا اور نمبر دار کی حکومت چلی آتی تھی۔ ہاں اس گاؤں سے باہر بہنوں کی حکومت آئی اور چلی گئی، آریہ، منگول، تاتاری، تبتی، نیپالی، چینی، مغل، سکھ اور اب ڈوگرہ سرکار کی حکومت تھی۔ ڈوگرہ سرکار کے بزرگ اعظم گلاب سنگھ نے اسے مسلمان بادشاہوں کے کمزور ہوتے ہوئے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ اور پھر آخر ایک دن بڑی انگریزی سرکار نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ لے کر کشمیر پر ڈوگرہ سرکار کا حق مان کر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دی تھی لیکن ان باہر کی بدلتی ہوئی حکومتوں نے ساگرہ کے گاؤں والوں کو نہ کوئی فائدہ پہنچایا تھا اور نہ ہی کوئی خاص نقصان، سینکڑوں سالوں سے وہ اپنی فصل کا ایک تہائی یا چوتھائی ادا کرتے آئے تھے، لگان ہو یا اناج ایک ہی بات تھی چوکیدارہ او جنگل کا محصول اور پٹواری اور راکھے کا خرچ سب ان کے ذمہ تھا کبھی کبھی مالک بے گار بھی لے لیتا تھا۔ کیونکہ جو مالک ہے وہ بے گار ضرور لے گا۔

اور پھر گو سال میں ایک ہی فصل ہوتی تھی۔ لیکن اگر تین یا چار ہوتیں تو بھی اس تخمینہ میں کیونکر فرق پڑ سکتا تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ کھانے کو دو وقت روٹی مل جاتی تھی۔ اور پہننے کو کپڑا۔ اور اگر روٹی کپڑے کی تنگی پیش آ جاتی تو وہ بھگوان کی دیا سے پردیس جا کر نوکری کر سکتے تھے۔ کھانا پکا سکتے تھے، اور اگر کھانا پکانا نہ جانتے تو جھوٹے برتن صاف کر سکتے تھے۔ اور دو تین روپیوں کے عوض مرد آیا بن سکتے تھے۔ وہ اپنی قسمت پر نہ شاکر تھے۔ نہ رنجیدہ، وہ ہزاروں سال سے ایک ہی ڈگر پر جا رہے تھے، انہیں اس امر کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ کہ ان کی قسمت اچھی ہے یا بُری، کیونکہ انھوں نے اُن کے بزرگوں نے، ان کے بزرگوں کے بزرگوں نے کبھی کوئی اور قسمت دیکھی ہی نہ تھی۔

اس گاؤں میں جمنا رہتی تھی، جمنا کا خاوند کھیتی باڑی بھی کرتا تھا اور دکان کا کام بھی سارے گاؤں میں صرف ایک یہی دکان تھی۔ اور ساگرہ کے چھوٹے سے کہسار میں ندی کے جنوب مغربی سرے پر واقع تھی۔ جہاں سے ایک پگڈنڈی باہر سے آتی ہوئی ساگرہ کے گاؤں کے قریب سے نالے کے ساتھ ساتھ گزرتی ہوئی اوپر شمال مشرقی کہساروں میں چلی جاتی تھی۔ اس پگڈنڈی کے ذریعہ سے ساگرہ کا تعلق باہر کی دنیا سے ہوتا تھا۔ اور اسی پگڈنڈی

پر جمنا کے مرحوم خاوند کی دکان تھی۔ وہ ایک دن پہاڑی نالے کو عبور کرنے
کی کوشش میں بہہ گیا تھا۔ اور نالے کی طغیانی اور بڑی بڑی چٹانوں کے نکیلے
کونوں نے جو پانی میں چھپے ہوئے تھے اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر دیا تھا اس
کی ٹانگوں کی ہڈیوں کو توڑ دیا تھا۔ اس کے بازوؤں کی انگلیوں کو ادھلی من صاف
کئے دھان کی طرح چھیل دیا تھا۔ پرمیشر کی مرضی تھی کہ اس غریب براہمن کی موت
اس طرح واقع ہو۔ یا اس براہمن کے پچھلے کرموں کا پھل تھا۔ اور اُس کی
جوان بیوہ کے نحس ستاروں کا' یا اس کے ننھے سے لڑکے کا جس کی عمر اب
ایک سال کی تھی۔ جمنا اپنے خاوند کے مرنے پر ستی نہ ہوئی تھی؛ وہ بہت چیخی
چلائی بھی نہ تھی۔ خاوند کے مر جانے سے زیادہ اسے اپنے بیوہ ہو جانے کا غم
تھا، وہ اب پھول سے کاڑھے ہوئے کپڑے نہ پہن سکے گی۔ چاندی کی بالیاں
اور باہوں کے کڑے اور کانوں کے دو جوڑ و اُسے اتارنے ہوں گے۔ اس کی
رگوں میں شباب کی سرمستی کا خون دوڑ رہا تھا۔ لیکن اچانک اسے احساس
ہوا کہ جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔ اور وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔ یہ
سوچ کر کہ اب کوئی اس کے نرم و گداز جسم کو اپنی چھاتی سے نہ لگا سکے گا اس
کے پتلے سے سرخ لبوں اور لمبی سرمئی پلکوں کی صف کو نہ چوم سکے گا۔ وہ بیتاب

ہو گئی تھی۔ اسے اپنے خاوند پر بہت غصہ آیا تھا۔ اور اس نے شوجی کے
پرانے مندر میں جا کر اپنے آپ کو دہلیز پر گرا دیا تھا۔ اور گڑگڑا کر مقدس دیوتا سے
پوچھا تھا۔ کہ اس کے ساتھ ایسا ظلم کیوں ہوا تھا۔ لیکن مقدس دیوتا نے اس کے
سوال کا کوئی جواب نہ دیا تھا یا شاید وہ مقدس دیوتا کا جواب سمجھنے سے قاصر
رہی تھی کچھ بھی ہو اس وقت بھگوان کے جواب سے جمنا کی تسلی نہ ہوئی تھی بعد
میں بوڑھے براہمن کے سمجھانے پر جمنا کا غصہ جاتا رہا۔ آہستہ آہستہ محض زندہ
رہنے کی جبلی خواہش اس کے باقی جذبات پر غالب آ گئی اس نے اپنے خاوند
کی دکان سنبھال لی۔ اور کھیتی باڑی کا کام ایک اور براہمن کے سپرد کر دیا۔ گاؤں
کے نمبردار اور دیگر بوڑھے پنچوں نے جمنا کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ دوکان بھی کسی اور آدمی
کے سپرد کر دے، اور خود شوجی کے مندر میں بیٹھ کر بھگوان کو یاد کرے۔ وہ خود اس لڑکے
کی نگہداشت کریں گے۔ یوں بھی تو ایک براہمن عورت کا دوکان پر بیٹھنا معیوب
ہوتا ہے۔ اور پھر جب وہ عورت ایک جواں سال بیوہ ہو اور جمنا جیسی حسین،
لیکن بدبخت جمنا نے ایک نہ مانی۔ اس نے دکان کا کام نہایت اچھے اصولوں
پر شروع کیا، وہ مسافروں سے نہایت خوش خلقی سے پیش آتی تھی اور گاہکوں
کو مسکرا کر سودا دیتی تھی اس کے خاوند کو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ اور

اب اس کی زندگی ایک ہندو بیوہ کی زندگی کی طرح حزیں اور افسردہ تھی۔ بلاشبہ بہت سے گاؤں کے بزرگ اس امر کو پسند نہ کرتے تھے لیکن جمنا کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ اس کا لڑکا اب دو سال کا ہو گیا تھا۔ اور اب وہی اس کی زندگی کا مرکز تھا۔ وہ صبح شام مندر میں پوجا کرنے جاتی اور دیوتا سے اپنے پیارے بچے کی زندگی اور صحت کا بردان مانگتی۔ اب اس کے دل کو ایک قرار سا آگیا تھا۔ اکھڑے اکھڑے قدم جم گئے تھے۔ صرف دل میں ایک ہلکی سی چبھن ایک خفیف سی خلش رہ رہ کر جاگ اٹھتی تھی۔ کہ جب کبھی مسافر اسے ترستی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس وقت اس کے گالوں کی رنگت شہابی ہو جاتی اور تنفس کا دورہ تیز ہو جاتا۔ اور وہ اپنے سارے بدن میں ایک سنسنی محسوس کرتی۔ یہی سنسنی اسے سردی کی سنسان راتوں کے اندھیارے میں محسوس ہوتی۔ جب اسے اپنے خاوند کا پیار یاد آتا اور وہ ایک لمبی سانس لے کر اپنے سوئے ہوئے بچے کے ننھے ننھے بازو اپنی چھاتیوں پر پھیلا لیتی۔ اور اس کا منھ زور زور سے چومنے لگتی۔ حتے کہ سویا ہوا بچہ جاگ کر رونے لگتا۔ یہ لمحے بہت تکلیف دہ ہوتے تھے۔ لیکن جمنا کو پورا یقین تھا کہ وہ بہت تھوڑے عرصے میں ان پر پورا قابو پالے گی۔ اور یہ اغلب تھا کہ وقت گذرنے پر جب شباب کا بہاؤ مدھم ہو جائے تو یہ تیز اور جنسی خلش بھی ہمیشہ کے لئے دب جائے۔

لیکن انہی دنوں میں علاقے کے تحصیلدار صاحب نے اپنے دورہ کے لئے ساگرہ کا مقام تجویز کیا۔

ساگرہ میں تحصیلدار کا دورے پر آنا گاؤں والوں کے لئے ایک اچنبے کی بات تھی۔ کیونکہ اس دور افتادہ مقام میں افسر لوگ بہت کم دورے پر آتے تھے۔ اور اکثر برسوں گزر جاتے اور گاؤں والوں کو اپنے حاکموں کی شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔ یوں بھی انہیں اپنے مالکوں سے کوئی خاص پیار نہ تھا۔ اور وہ یہی بہتر سمجھتے تھے کہ انہیں الگ تھلگ رہنے دیا جائے۔ وہ اپنے براہمن اور بڑی سرکار کے احکام کی پوری متابعت کرتے رہیں گے۔ اور پھر یہ تو ان کی خوش نصیبی ہی تھی۔ کہ ساگرہ ایک ایسی حقیر سی تنگنائے میں واقع تھا۔ جہاں کسی افسر کا دل آنے کو نہ چاہتا تھا۔ تنگ سی وادی، سنگلاخی پہاڑ، ان کے نیچے دیوداروں کے گھنے جنگل۔ اور دیوداروں کے نیچے چیڑھ اور دیار اور ان کے نیچے چند کھیت، چراگاہیں گاؤں۔ دھان کے کھیت اور سب سے نیچے پہاڑی نالہ ایک چور کی طرح اس وادی میں سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ براہمنوں کے گاؤں میں قتل و خون کہاں؟ اس لئے سینکڑوں برسوں سے یہاں کسی نے پولیس کے آدمی کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی یہ جگہ بہت مایوس کن تھی رمینوں کے جھگڑے

یہاں براہمن پنچ آپس میں ہی طے کر لیتے تھے۔ غرضیکہ افسر لوگوں کی دلبستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ ان حالات میں تحصیلدار صاحب کا دورہ پر آنا یقیناً ایک اچنبھے کی بات تھی تحصیلدار ایک گٹھیلا، سجیلا خوبرو جوان تھا، چوڑی چھاتی، مضبوط ٹھوڑی اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت مونچھیں، جب جمنا نے اُسے اپنی دکان کے سامنے سے گھوڑے پر سوار گزرتے ہوئے دیکھا تو دنگ رہ گئی، ساگرہ کے براہمن تو اس کے سامنے بالکل مریل ٹٹو سے دکھائی دیتے تھے، تحصیلدار نے ایک خاکی رنگ کی برجس پہن رکھی تھی اور سر پر خاکی ٹوپی تھی، اور ہاتھ میں بید کی چھڑی جس کے سرے پر ایک چمڑے کا پھندنا لگا ہوا تھا اس کی ہر بات عجیب تھی، اور جب اس نے نگاہ پھیر کر جمنا کی طرف دیکھا تھا، تو جمنا کے جسم کا رواں رواں کانپنے لگا تھا۔ وہ اس وقت ترازو میں مصری تول کر ایک مسافر کو دے رہی تھی۔ اور وہ ترازو چند لمحوں کے لئے اس کے ہاتھ میں لٹکتا ہوا رہ گیا تھا۔

دن بھر تحصیلدار صاحب نے چرڑھوں کے ایک پتلے جھنڈ کے نیچے اپنا دربار لگایا۔ وہ خود ایک بید کی کرسی پر بیٹھے اور گرداور، قانون گو اور منشی متصدی ان کے پاؤں کے قریب زمین پر۔ اس طرح حاکموں کے دربار میں

ساگرہ کی رعیت کی ہنسی ہوئی۔ غریب براہمن ڈر سے مرے جا رہے تھے جس طرح ہر بشر اپنے خدا سے ڈرتا ہے اور جا و بے جا اس کی خوشامد و چاپلوسی پر تُلا رہتا ہے۔ اس طرح بلا وجہ ماسٹر کی گھُرکی سے ڈرے ہوئے بچّوں کی طرح تحصیلدار کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور منشیوں اور مصدیوں کی خوشامد کر رہے تھے۔

منشی عبد الرحمٰن نے اپنی مولویانہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "لیے حرامزادو، وہ گھاس کے گٹھے ابھی تک نہیں پہنچے۔"

راجہ رام براہمن ہاتھ جوڑ کر بولا "حضور میں خود ابھی چار گٹھے گھاس کے باندھ کر لایا ہوں۔"

منشی عبد الرحمٰن نے گرج کر کہا "حضور کے بچّے چار گٹھوں سے کیا ہوتا ہے۔" پھر تحصیلدار صاحب کی طرف مڑ کر بولا "حضور سالہا سال سے کسی افسر نے اس علاقہ کا دورہ نہیں کیا۔ اب اس کا نتیجہ دیکھئے، حضور کے تشریف لانے پر گھاس کے صرف چار گٹھے پیش کئے جاتے ہیں۔ اور مرغی ایک بھی نہیں۔ یہاں کے لوگ کتنے خودسر ہو گئے ہیں۔"

نمبردار نے ڈرتے ڈرتے عرض کی "حضور! منشی صاحب یہ براہمنوں کا

گاؤں ہے۔ یہاں ہم لوگ نہ مرغیاں پالتے ہیں نہ کھاتے ہیں۔ اور کوئی دوسرا گاؤں نزدیک نہیں۔"

گھسیٹا رام پیشکار نے چلا کر کہا۔" یہ کتا براہمن کیا بکواس کرتا ہے باندھ دو اسے درخت سے اور لگاؤ کوڑے۔ تاکہ اسے افسروں کے سامنے بات کرنے کا سلیقہ آجائے۔"

بوڑھا براہمن کانپنے لگا۔ تحصیلدار صاحب اپنی چھوٹی چھوٹی خوبصورت مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ہنسنے لگے۔ بولے۔" نہیں، نہیں، یہ بے چارہ سچ کہتا ہے۔ اچھا تم یہاں کے نمبردار ہو نا؟"

"جی"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"ست نرائن حضور۔"

تحصیلدار صاحب پھر مسکرادیئے۔" تم بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو، ست نرائن۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ آج رات کو ہمارا کیمپ کہاں لگے گا۔"

نمبردار نے فوراً جواب دیا۔" جو جگہ حضور پسند فرمائیں وہی ــــ"

تحصیلدار صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔" میرے خیال میں

اس بڑی دکان کی چھت اچھّی رہے گی۔ وہ دوکان جو ہم نے پیچھے راستے میں دیکھی تھی۔

ست نرائن بولا" وہ حضور جمنا بیوہ کی دوکان ہے"

"ہاں ہاں وہی ــــ اچھّا ــــ وہ ــــ جمنا بیوہ کی دوکان ہے ــ جمنا"

"ہاں حضور، وہ بیوہ ہے۔ پارسال اس کا خاوند رام بھروسے اس نالے میں بہہ گیا تھا ــ"

تحصیلدار صاحب نے قدرے توقف کے بعد کہا" ہاں، ہاں تو پھر وہی جگہ بہتر ہے۔ کیوں پیشکار صاحب؟"

پیشکار صاحب نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا" بجا فرمایا حضور نے کھلی جگہ ہے۔ کشادہ چھت ہے۔ گاؤں سے باہر بھی ہے۔ کھلی ہوا بھی ہے"

ست نرائن بولا" جیسی مرضی حضور کی لیکن اگر حضور چاہیں، تو میرے مکاں کی چھت پر اپنا خیمہ لگوالیں۔ وہ چھت اس سے بھی زیادہ کھلی اور کشادہ ہے ــ"

پیشکار بولا" نہیں نہیں، وہی جگہ بہتر رہے گی"

اور منشی عبدالرحمٰن نے ایک آنکھ میچ کر آہستہ سے پیشکار کے کان میں

کہا: میں اس لونڈے کے مذاق کی داد دیتا ہوں، کم بخت نے کیسی حسین مرغی
تلاش کی ہے" اور یہ کہکر اپنی گھنی داڑھی کے ایک دو بالوں کو مسلنے لگے۔
حمنا نے وہ رات ست نرائن نمبردار کے گھر بسر کی۔ دوسرے دن وہ
دکان پر بھی نہ گئی، تیسرے دن تحصیلدار صاحب کا خیمہ بدستور اس کی دُکان کی
چھت پر لگا ہوا تھا۔ اس طرح ایک دو دن اور گزر گئے اور تحصیلدار صاحب
کو شامدساگرہ اس قدر پسند آیا تھا کہ وہ اس گاؤں سے ہلنے کا نام نہ لیتے
تھے۔ دن بھر دیودار کے جنگلوں میں شکار کرتے، ریچھ اور سور مارتے، یا جنگلی کبوتر
اور شام کو اپنا دربار لگاتے، جہاں گاؤں والوں کی پیشی ہوتی تھی، اور گاؤں کے
مالیانے اور معافی کے متعلق تنقیحیں نکالی جاتی تھیں، اور تحصیلدار صاحب کا اندازہ
تھا کہ اس گاؤں کا مالیانہ بڑھنا چاہیئے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ اس گاؤں کے
براہمن بہت بدمعاش ہیں۔ اور جنگل میں بہت چوری کرتے ہیں۔ بلا اجازت لکڑیاں
کاٹتے ہیں۔ بنفشہ اکھیڑ لاتے ہیں۔ اور انار دانہ تیار کرتے ہیں۔ وہ ضرور جنگلات
کے محکمہ کو لکھیں گے کہ ان چیزوں کا انسداد ہو، اور پھر یہاں گاؤں والوں نے
بلا اجازت بہت سی سرکاری زمین کاشت کر لی تھی اور اب پٹواری ان تمام
اشخاص کو چھ چھ مہینے کے لئے جیل میں بھیجدیں گے۔ اور ان کی زمینیں اور

مکان قرق کرلیں گے۔ اور پھر اس حرامزادے نمبردار نے پچھلے سال کا بقایا لگان ابھی تک ادا نہیں کیا تھا۔ کم از کم انہیں بہت شک تھا کہ آیا وہ ہر پچھلے سالوں میں باقاعدہ لگان ادا کرتا رہا تھا۔ اور گرداور قانون گو اور پٹواری مناسب تحقیقات کے بعد تحصیلدار صاحب کے سامنے رپورٹ پیش کریں گے اور تحصیلدار صاحب نے تہیہ کر لیا تھا کہ ایسے بددیانت نمبردار کو موقوف کر دیا جائے اور ڈھائی سال کے لئے جیل میں ٹھونس دیا جائے ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے اور پیشکار صاحب کی مربیانہ اور مشفقانہ صلاح و مشورہ کے ساتھ ساگرہ کے براہمنوں نے گاؤں کی تین نوخیز بہوئیں رام دیئی، دلاری اور کھیتری اپنے ارضی دیوتاؤں کو نذرانے میں پیش کیں۔ کیونکہ انسان کو اپنی عزت و ناموس سے اپنی جان زیادہ پیاری ہوتی ہے اور غریب کسانوں کی زندگی کا دار و مدار چاہے وہ براہمن ہی کیوں نہ ہوں، یہی زمین ہے۔ جسے کاشت کر کے وہ اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اور جب یہ زمین ہی قرق ہو گئی۔ یا مالکوں نے اپنی زمین واپس لے لی۔ تو پھر وہ غریب لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ پیٹ کی مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے، لیکن جمنا کے دل میں نہ جانے کس نے کیا پتھر کے ٹکڑے بھر دیئے تھے، وہ کم بخت ایک ہی ہٹ پر قائم تھی، کہ وہ بھوکی مر جائے گی، چاہے اس کی زمین قرق ہو جائے،

چاہے اس کی دوکان ضبط کرلی جائے، لیکن وہ تحصیلدار کے پاس نہ جائے گی،
کبھی نہ جائے گی کبھی نہ جائے گی، اُسے اپنے مرتے والے خاوند کی سوگند، اپنے
ننھے بیٹے کی قسم۔

لیکن جمنا کی یہ ہٹ گاؤں والوں کے حق میں مفید نہ تھی، اب تو گاؤں کے
ایک دو بوڑھے براہمنوں کی بے عزتی بھی کی جا چکی تھی، ان کی سفید داڑھی کو نوچا گیا
تھا۔ اور ان کی گاڑھے کی موٹی موٹی پگڑیاں اتار کر ان کی چندیا پر اتنے دھپ لگائے
گئے تھے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو آ گئے تھے اور یہ سب کچھ لگان اور آب پانے اور
سرکاری زمین پر خلافِ قانون قبضہ جمانے کے سلسلہ میں ہوا۔ رام دیہی، دلاری
اور کھیتری کی قربانی کے بعد بھی ارضی دیوتاؤں کی بھوک نہ مٹی تھی۔ یوں تو تحصیلدار
صاحب اپنی زبان سے کچھ نہ کہتے تھے۔ لیکن دیوتاؤں کو کب کسی نے بولتے دیکھا
ہے۔ وہ خاموش رہتے ہیں، لیکن پجاری جانتا ہے کہ اس کے اشٹ دیو کو کس چیز
کی بھینٹ چاہیے۔ ساگرہ کے گاؤں والے بھی جانتے تھے۔ لیکن وہ بیحد پریشان
تھے، کیا کریں، کیا نہ کریں، اپنے گھر کی لڑکی، بہن یا بہو ہوتی، تو اُسے کسی طرح راضی
کر لیتے، لیکن جمنا، بیوہ جمنا تو ایک ہی کم ذات عورت تھی۔۔ وہ دوکان پر بے شرم
و بے حیا بن کر مردوں کی طرح کام کرتی، نہ آج یہ نوبت آتی، یہ سب آفت اسی کی وجہ

آئی تھی اور یہ آگ اسی نے لگائی تھی۔ گھاس کے گٹھے پہنچاتے پہنچاتے دوسرے گاؤں سے انڈے اور مرغیاں لاتے لاتے اور مکھن اور آٹا اور باسمتی کے خوشبودار چاول دیتے دیتے وہ غریب بے انہیں بہت تنگ آ گئے تھے۔ اور دن رات سوچتے تھے کہ جمنا کو کس طرح منایا جائے۔ رام دیئی، دلاری اور کھیتری نے اس کے آگے اپنے دکھوں کا رونا رویا اور بتایا کہ کس طرح اس کے لئے محض اس کے لئے اُن کی عصمت تباہ و برباد کی گئی، اور اب بھی وہ گاؤں والوں کو بے شرمی، بے حرمتی اور بے حیائی سے بچا سکتی تھی۔ اگر وہ ـــ اگر وہ ـــ مان جائے۔ آخر اس مصیبت کے وقت وہ گاؤں والوں کے کام نہ آئے گی۔ کیا وہ اتنی قربانی بھی نہ دے سکتی تھی۔ اور پھر اسے طعنہ دینے والا کون تھا۔ وہ تو ایک بیوہ ہی تھی۔

جمنا نے جھلا کر کہا، ہاں، ہاں، میں بیوہ ہوں۔ اسی لئے تو تم مجھے اپنی خود غرضی کا آلہ کار بنانا چاہتی ہو۔ اگر آج میرا خاوند جیتا ہوتا۔ تو تمہاری طرح باتیں کرنے والیوں کی زبان کھینچ لیتا۔ اور تمہاری چوٹی پکڑ کر اس طرح گھسیٹتا کہ تمہارے یہ موم سے چمکتے ہوئے سر ایک گھڑی میں گنجے ہو جاتے۔ کلموہیاں اپنی عصمت کو بیچ کر اب مجھ سے سودا کرنے آئی ہیں۔ اور کھیتری نے غصہ میں چلا کر کہا "یہ آج تم باتیں کر رہی ہو سو کہتی ہوں اگر تمہارا خاوند آج زندہ ہوتا تو وہ تمہاری چوٹی پکڑ کر خود اس بوئے

تحصیلدار کے پاس لے جاتا، اس طرح کہ جس طرح ہمارے خاوند ـــــ اور کھیتری آگے کچھ نہ کہہ سکی، غم و غصہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اسے روتے دیکھ کر رام دیئی اور دُلاری بھی رونے لگیں۔ اور پھر جمنا بھی۔

دوسرے دن جمنا کا دل ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ وہ جائے یا نہ جائے ایک طرف کنواں دوسری طرف کھائی۔ وہ خود دیکھ رہی تھی۔ کہ گاؤں کے بڑے بوڑھے بزرگوں کی کس طرح بے عزتی و بے حرمتی کی جا رہی تھی اسے اس امر کا بھی ڈر تھا کہ لگان بڑھ جائے گا۔ اور گاؤں والے عمر بھر اسے کوسیں گے۔ بہتوں کو سزا ہو گی۔ کئی جیل کی ہوا کھائیں گے۔ جیل؟ اس کے جی میں آیا کہ وہ خودکشی کر لے پھر تو گاؤں کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ لیکن اس کا ایک ننھا سا لڑکا تھا اور خود بھی وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ خیال اسے صرف ایک لمحہ کے لئے آیا تھا اور دوسرے لمحے میں اس نے اُسے رد کر دیا۔ آخر ہو گا کیا؟ کیا وہ گاؤں والوں کے لئے یہ قربانی نہ کر سکتی تھی، یہ ایک قربانی ہی تو تھی، جیسا گاؤں کے بوڑھے نمبردار نے اسے بتایا تھا، اور دھرم شاستروں میں اس نے پڑھا تھا، ایسی قربانیاں جائز سمجھی جاتی ہیں۔ یقیناً پاپ نہ ہو گا۔ بوڑھے نمبردار نے اپنی پگڑی اتار کر جمنا کے پاؤں میں رکھ دی تھی، اور اس نے گلوگیر آواز میں التجا کی تھی، کہ گاؤں کو اس مصیبت سے بچا لے، تحصیل والوں کی منجلیاں

ہر روز بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور اگر یہی حالت رہی تو چند دنوں میں اس گاؤں میں گھاس کا ایک تنکا نہ ملے گا۔ اور ان کے ڈھور ڈنگر موسم سرما میں بھوک سے مر جائیں گے۔ عجیب حالت تھی۔ اس مصیبت سے نجات کا ایک ہی راستہ تھا۔ کیا وہ اپنے بوڑھے بزرگ کی استدعا کو رد کر دے گی۔

جمنا یہ باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔ اس نے چادر سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور رمن سے گھاس کے تنکے توڑنے لگی۔

. . . .

دوسرے دن تحصیلدار صاحب ساگرہ سے رخصت ہو گئے۔ وہ بوڑھے نمبردار سے نہایت ملاطفت آمیز انداز سے پیش آئے اور انہوں نے وعدہ کر لیا کہ نہ تو وہ لگان بڑھائیں گے۔ اور نہ ہی کسی کو جیل کی ہوا کھلائیں گے۔ بلکہ وہ بوڑھے نمبردار کے لئے ذیلداری کی سفارش کریں گے۔ یکایک انہیں احساس ہوا کہ اس گاؤں کے لوگ بہت شریف الطبع، مہمان نواز اور سرکار کے وفادار تھے، اور وہ حکام بالادست کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں گے۔ منشی عبدالرحمٰن اور پیشکار گھسیٹا رام بھی بہت خوش تھے۔ گاؤں کے پنچوں نے ان کی مٹھی بھی گرم کر دی تھی تحصیل والے بھی خوش تھے۔ اور تحصیل کے جانور بھی جنہیں تازہ گھاس اور سی مکّی

کے دانے ہر روز کھلائے گئے تھے جب تحصیل والوں کا قافلہ گاؤں سے چلا تو کئی من باسمتی کے خوشبودار چاول خچروں پر لدے ہوئے تھے۔ ایک بڑے ٹوکرے میں ایک مزدور مرغیاں لئے جا رہا تھا جو پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی بار بار کڑکڑاتی تھیں، دو براہمن تحصیلدار صاحب کے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے تھے۔ اور تحصیل کے باقی اہل کاروں کے ساتھ بھی اسی طرح ایک ایک آدمی لگام تھامے چلا آ رہا تھا،

گاؤں کی حد سے باہر آ کر پیشکار نے عرض کی۔ حضور موضع کھلا تھستہ چند ایک انتقال کی مسلیں ہیں۔ یہاں سے کوئی دس کوس ہو گا۔

گھوڑوں کی باگیں موضع کھلا تھستہ کی طرف موڑ دی گئیں۔ پتلی سی پگڈنڈی پر چلتا ہوا یہ لمبا قافلہ خود پنڈاروں کا گروہ معلوم ہوتا تھا۔ جو نہتی رعایا سے اپنی خون آشامیوں کا خراج وصول کرنے جا رہا ہو۔ پگڈنڈی ایک اونچے پہاڑ کے گرد چکر کھاتی ہوئی اوپر اٹھتی ہوئی جا رہی تھی۔ قافلہ چلتا گیا۔ اور حائف براہمن خاموش کھڑے اُسے دیکھتے رہے۔ انہیں یقین نہ ہوا کہ تحصیل والے ان کے گاؤں سے چلے گئے ہیں۔ اور پھر شائد کبھی برس تک ادھر نہ آئیں گے۔ انہیں خیال ہوا کہ جب وہ واپس اپنے گاؤں میں جائیں گے تحصیل والوں کو بدستور وہاں موجود پائیں گے، بوڑھے نمبردار نے سوچا کہ تحصیل والوں کی آمد اس گاؤں کے لئے کسی بڑی سماوی

آفت کا نتیجہ تھی۔ اور یہ کہ آسمانی دیوتاؤں کا قہر بجلی بن کر ساگرہ پر ٹوٹے گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ گیا۔ لیکن پنڈارے اپنا خراج وصول کر چکے تھے۔ اور اب وہ موضع کھلا نصتہ کی سمت جا رہے تھے۔ اور انہوں نے مڑ کر ایک بار بھی موضع ساگرہ کی طرف نہ دیکھا جیسے انہوں نے اب ایک نچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح ایک طرف پھینک دیا تھا۔ آہستہ آہستہ قافلہ چلتا ہوا اور پگڈنڈی پر پھیلے ہوئے کثیف بادلوں کے غلاف میں غائب ہو گیا۔ اور ساگرہ کی مٹی کے بے جان بتوں میں حرکت پیدا ہوئی خشک لبوں پر زبانیں پھرنے لگیں۔ لمبی لمبی آہیں اور آرام کے سانس۔

اس انسانی سماج میں جہاں یک جہتی اور مساوات نہیں ظلم کی اندھی رو اوپر سے آتی ہے اور برق کی تیز رفتاری کے ساتھ منتقل ہوتی ہوئی سماج کی نچلی تہوں میں پہنچ جاتی ہے، جہاں اس کی ٹھوکر سب سے زیادہ خوفناک شدید اور قہرمانی ہوتی ہے۔ سماج کے اندھے نظام کا وہ عتاب جو ساگرہ کے براہمنوں پر نازل ہوا۔ ایک بجلی بنکر جمنا پر ٹوٹا۔ جمنا وہ سونے کی مورت کی طرح چمکتی ہوئی جمنا، جس نے اس رات گاؤں والوں کی خاطر اپنے شباب کی تمام رعنائیاں پنڈاروں کے سردار کی حریص آغوش میں موتیوں کی طرح بکھیر دی تھیں۔ وہی جمنا آج تحصیل والوں کے چلے جانے کے بعد بوڑھے براہمنوں کے غم و غصہ کی شکار ہوئی۔ اگر جمنا یہ سمجھتی تھی کہ اس نے اپنی قربانی

سے گاؤں والوں کو مشکور کر دیا تھا۔ تو یہ اس کی بڑی بھول تھی۔ اگر وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس نے کوئی نیک کام کیا تھا۔ تو یہ اس کی غلطی تھی۔ اگر گاؤں کے بوڑھے نمبر دار نے اُسے ایسا کرنے کو کہا تھا۔ تو یہ ایک فرض تھا جو بوڑھے نمبر دار پر گاؤں کو بچانے کے لئے اُس پر عائد ہوتا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے، کہ وہ عورت جس کے برہنہ حُسن کی بدولت ان پر یہ آفت آئی تھی۔ یوں گاؤں میں دندناتی پھرے اور آئے دن گاؤں والوں کو مصیبت میں پھنساتی رہے کیونکہ جب ارضی دیوتا کے مُنہ کو خون لگ جاتا ہے تو اس کی حرص بڑھ جاتی ہے اور گو سب دیوتا زبان نہیں رکھتے۔ لیکن سب دیوتاؤں کی نگاہیں ایک ہوتی ہیں۔ پھر کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تحصیلدار صاحب کے بعد تھانے دار صاحب تشریف لے آئیں اور تھانیدار کے بعد جنگل کا فارسٹر یا محاصلات کا افسر

چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد گاؤں کی برادری نے فیصلہ کیا کہ جمنا کو برادری سے خارج کیا جائے اسے اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیا جائے۔ اس کی دوکان سے سودا سلف نہ خریدا جائے اس کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ چشمے سے پانی نہ بھرنے دیا جائے، گاؤں کی کوئی عورت اس سے کلام نہ کرے اور جمنا کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ جلد سے جلد گاؤں کو چھوڑ کر چلی جائے۔ برادری نے اس کے علاوہ ایک بھاری یگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں سب گاؤں والے پرائشچت کریں گے۔ اور جہاں رام دئی،

دلاری، اور کھیتری کو بیاہتم دیا جائے گا۔ اور شوجی مہاراج کے مقدس مندر کے گرد ایک سو ایک دفعہ پرکرما لے کر دعا کی جائے گی کہ ساگرہ کے باشندے آئندہ اس قسم کے عتاب سے محفوظ رہیں۔

شاید جمنا کا دل اس غیر متوقع چوٹ کو نہ سہ سکا۔ آسے پھر کبھی کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ اور اس کی روح نہایت سختی سے کچلی گئی ہے۔ کیونکہ اب اس کی نگاہیں اوپر نہ اٹھتی تھیں۔ آسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک غیر معلوم سی شے لطیف جو پہلے تھی اب نہیں ہے۔ اور کہ کسی نے یکایک گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا ہے۔ اس باطنی خلا کو گاؤں والوں کے ظلم و تشدد نے اور بھی تیز کر دیا۔ چند دن وہ کھوئی کھوئی سی رہی اس کی آنکھوں میں آنسو نہ رہے۔ نہ اپنے بچّے کے لئے بہلا سا پیار جب عورتیں جتھے پر پانی بھرنے کے لئے مٹی کی گاگریں اٹھائے ہوئے اس کی دوکان کے سامنے سے گزرتیں، تو ان کے طعن و تشنیع کے تیر اس کے زخمی جگر کے آر پار ہو جاتے لیکن آنکھوں میں آنسو نہیں تھے جو اس کے رخساروں پر ڈھلکتے اور اس کی روح کو سیراب کر سکتے، چند ہی دنوں میں اس کا شباب مر گیا، جوانی تھی، حسن تھا، دلفریبی تھی، لیکن روح غائب ہو گئی تھی، اور جس دن برائشچت کا یگ رچایا گیا، اور نیلے آسمان اور ہرے بھرے کھیت

اور عورتوں کے گانے اور ان کے نئے لباس اور بچوں کے دلکش قہقہوں نے اس کی روح کو لرزا دیا تو وہ بیقرار ہو گئی اور بھاگی بھاگی بوڑھے نمبردار کے پاس پہنچی۔ اور اس کے پاؤں پر جا گری۔ لیکن نمبردار نے اپنے مقدس پاؤں پرے کھینچ لئے اور اسے درشتی سے جھڑک دیا۔ اور کہا کہ وہ ایک ناپاک عورت تھی۔ اسے کوئی حق نہ تھا کہ وہ یگ میں شامل ہو کر پرائشچت کر سکے۔ برادری کا فیصلہ سب کے لئے یکساں تھا۔

سہ پہر یگ ہوتا رہا۔ اور بوڑھے براہمن سنسکرت اور ہندی کے ملے جلے غلط شلوک پڑھتے رہے۔ ہون اور سامگری کا خوشبودار دھواں اوپر آسمان کی طرف اٹھتا رہا۔ کہ ... جی، دلاری اور رام دیئی نے نیا جنم لیا۔ گاؤں کے ہر ایک فرد نے پرائشچت کیا گھی، شکر، آٹے اور گڑ کا بنا ہوا حلوا سب میں تقسیم کیا گیا۔ لیکن جمنا کو کسی نے نہ پوچھا اور نہ ہی اسے یگ منڈپ کے نزدیک آنے دیا۔

شام کو شوجی کے مندر کے گرد پرکرما لے کر اور سنکھ اور گھڑیال بجا کر مندر کے کواڑ بند کر دیئے گئے اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بہت دیر کے بعد جمنا شوجی کے مندر کے قریب آئی، وہاں کوئی نہ تھا مندر کے کواڑ بند تھے۔ اس نے چاہا کہ وہ بھی مندر کے گرد پرکرما لے۔ لیکن اسے کواڑ کھولنے کا اب حوصلہ نہ ہوا۔ وہیں

دروازے کے باہر کھڑی ہوکر اپنی گردن میں اپنے سر کی اوڑھنی ڈال لی اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی، وہ بہت دیر وہاں کھڑی رہی، سورج کی آخری کرنوں کا طلائی جال چیڑھ اور دیودار کے درختوں پر پھیلتا ہوا پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا پہنچا۔ اور پھر شفق کی ایک آخری خونی لکیر میں مبدّل ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ سرخ لکیر بھی غائب ہو گئی۔ اور پہاڑ اور ان کا سبزہ اور وادی اور کہسار نیلے اور سیاہ رنگوں کے ایک عجیب سے امتزاج میں کھوئے گئے۔ اور ان کے نقش ہر لحظہ غیر معیّن اور غیر واضح ہوتے گئے۔ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں جمنا کے دل نے بار بار مندر کے معبود سے پوچھا کہ آخر کیا اس کے گناہ کا کوئی کفارہ نہ تھا، کیا وہ سچ مچ گاؤں والوں سے زیادہ گناہ گار اور قصوروار تھی، لیکن جب اس کے بار بار پوچھنے پر مندر کے معبود نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ اور مندر کے کواڑ نہ کھلے۔ اور رات کی تاریکی میں شوجی کا مقدس مندر اس پر ہنستا ہوا معلوم ہوا، تو یکایک اُس کے ایماں کی دیواریں گر گئیں۔ اس کا زخمی غرور اس کے دل میں ایک کچلے ہوئے پھنیر کی طرح بلند ہو گیا۔ اور وہ تیز تیز قدموں سے واپس لوٹ آئی۔

وہ پگڈنڈی جو گاؤں سے باہر گھاٹیوں اور جنگلوں میں سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی، رات کی تاریکی میں امید کی آخری کرن کی طرح دکھائی دے رہی تھی، لیکن اس

رات ساگرہ کے کسی براہمن نے اس پگڈنڈی پر گزرتی ہوئی عورت کو نہیں دیکھا
جس کے بال کھلے تھے۔ اور جس کی گردن میں ایک میلی اوڑھنی کے دو پلو لہرا رہے
تھے اور جس کے چہرے پر نہ خوشی تھی نہ غم، نہ یاس، نہ آمید، نہ زندگی تھی نہ موت،
اور جو تیز تیز قدموں سے بھاگی جا رہی تھی۔ اس عورت کو کسی کا ڈر نہ تھا، اس عورت
کو کوئی روکنے والا نہ تھا، پہاڑوں کی فضاؤں میں ایک ایسی ہیبت ناک خاموشی
گھلی ہوئی تھی جیسے وہ کسی کی مٹتی ہوئی زندگی کا آخری منظر دیکھ رہے ہوں، ایک لمبا
ہولناک سناٹا جس کے پس پردہ کسی آنے والے طوفان کی گونج سنائی دیتی تھی۔

لیکن اس رات ساگرہ کے کسی براہمن نے اس پگڈنڈی پر گزرتی ہوئی
عورت کو نہیں دیکھا، ہاں چند روز کے بعد انہوں نے سنا کر موضع کھوئی راٹھ کے
قریب ایک ندی کے نشیب میں ایک نوجوان عورت کی لاش پائی گئی، اس کا
حلیہ جمنا سے ملتا جلتا تھا۔ گاؤں کے بوڑھے نمبردار نے جمنا کے لڑکے کی پرورش
کا ذمہ اپنے تئیں لیا، اور جمنا کی زمین اور دکان بھی اپنے قبضہ میں لے لی۔

شعلۂ بے دُود

یہ بچپن کی بات ہے، میرے ماں باپ مر چکے تھے اور میں اپنے دادا کے پاس رہتا تھا۔ دادا گاؤں کے مالک تھے، اور علاقے کے امیر ترین زمینداروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دل میں اب بھی اس بوڑھے بزرگ کی تصویر باقی ہے اور سارے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا کر دیتی ہے، فربہ جسم، لامبا قد گل مچھے، اور آنکھیں کبوتر کی طرح سُرخ، آواز میں شیر کی سی گرج، ایسا آدمی جسے دیکھتے ہی دل پر ہیبت طاری ہو، جس کے سامنے کھڑے ہو کر گھگھی بندھ جائے، آج کل مشکل سے دیکھنے میں آتا ہے، مجھے یاد ہے جب وہ گرج کر مجھے ہدہدی انداز میں ڈانٹتے تھے تو میرے سارے جسم میں رعشہ طاری ہو جاتا تھا۔ اکثر اس طرح ہنستے

تھے کہ اگر ہمارا پرانا نوکر جمن بیچ میں پڑ کر مجھے نہ بچاتا تو میں کب کا اللہ میاں کے پاس پہنچ گیا ہوتا، خدا بخشے آج کل جمن میاں اور میرے دادا وہاں ہیں، اور میں ابھی زندہ ہوں۔ اور پھر ایک دن میں بھی مر جاؤں گا۔ اور پھر ایک دن آپ بھی مر جائیں گے کیونکہ موت اور غلامی سب پر لازم ہیں۔

ان دنوں میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرے دادا مجھے کسی کے ساتھ نہ کھیلنے دیتے تھے، ہمارا گھر موضع کے باقی گھروں سے الگ تھلگ ایک اونچے ٹیلے پر تھا، میرے دادا دن رات شراب پیا کرتے تھے، اور جب شراب نہیں پیتے تھے تو حقہ پیتے تھے اور جب حقہ نہیں پیتے تھے تو سوتے تھے اتنے بڑے گھر میں دو نوکر تھے، ایک بوڑھی، ماماتھی، جس کا زرد، بدصورت مرجھایا ہوا چہرہ مجھے برستانی چڑیلوں کی طرح معلوم ہوتا تھا، اکثر وہ اپنے آپ سے باتیں کیا کرتی۔ اور کبھی وہ اپنے زرد کریجی دانتوں کی نمائش کرتی ہوئی اس انداز سے قہقہہ لگاتی کہ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، رات کو سوتے وقت، وہ مجھے اکثر خواب میں دکھائی دیتی۔ کبھی وہ اپنے بیلے بیلے غلیظ دانت دکھاتے ہوئے میرے قریب آتی ہوئی معلوم دیتی۔ کبھی میرے دادا کی لال لال آنکھیں مجھے گھورتی ہوئی نظر آتیں اور میں بستر پر سے چیخ مار کر اچھل پڑتا، رانوں کو جمن مجھے

پچکار کر سلاتا تھا۔ اور پہروں میرے پاس بیٹھا رہتا، میں اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے اس کے انگوٹھے کو پکڑ کر سونے کی کوشش کرتا اور پھر آخر ایک گہری غنودگی میں کھو جاتا۔

اپنے والد تو میں نے دیکھے نہ تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا۔ اور جب میں پہلی جماعت میں داخل ہوا تو والدہ بھی چل بسیں، اس لئے ماں باپ کے لاڈ پیار کا مجھے کوئی خاص تجربہ نہیں۔ اب تو اپنی والدہ کے نقوش بھی بالکل دھندلے سے باقی رہ گئے ہیں مثلاً اُن کا چہرہ اب پہچانا نہیں جاتا، ہزار بار کوشش کرنے پر بھی اُن کی صورت ذہن میں نہیں آتی، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دیکھنے میں وہ کیسی تھیں صرف گداز باہوں کا تصور کر سکتا ہوں یا وہ چھاتیاں ذہن میں آتی ہیں جن سے لگ کر میں دودھ پیتا تھا۔ اور سینے پر جھکتا ہوا سونے کا ایک لاکٹ، جو ابھی تک لرز رہا ہے، اور نتھنوں میں اُن کے جسم کی خوشگوار بو پھیلتی ہوئی معلوم دیتی ہے، یہ خوشبو اب بھی باقی ہے، اس بڑھاپے کے دور میں بھی اب تک میرے نتھنوں میں بسی ہوئی ہے۔ اب بھی جی چاہتا ہے کہ اک بچہ بن جاؤں اور اپنے ننھے ہاتھوں سے اس کے سینے پر رینگتا پھروں

لیکن جب میں بچہ تھا۔ ان دنوں ماں باپ کی یاد نہ ستاتی تھی، اک نیم

ویرانی، نیم تاریکی اس بڑے گھر میں چھائی ہوئی تھی، کمرے وسیع معلوم ہوتے تھے دروازے بلند، چھتیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور ابھی اکدم سر پر ٹوٹ پڑیں گی، اس ہولناک تنہائی میں اپنا سانس بھی اجنبی معلوم ہوتا تھا۔

گھر سے کچھ دور ندی کے کنارے پن چکی تھی، پانی اس کے پاٹوں کے نیچے سے گزرتا تھا، اور دوسری طرف ڈھلوان پر سفید جھاگ اڑاتا ہوا، شبنمی موتیوں کی پھوار بکھیرتا ہوا نیچے وادی کی طرف بہتا جا رہا تھا، پن چکی کے پاٹ اب ساکن تھے۔ کسی زمانے میں یہ پن چکی چلتی تھی، لیکن میرے دادا کو یہ منظور نہ تھا، کہ ان کے گھر کے اس قدر قریب پن چکی ہو اور غریب کسان اور کمین وہاں آکر آٹا پسوا کر لے جائیں، اور آٹا پسوانے والی عورتوں سے ہنس ہنس کر باتیں کریں گیت گائیں، شور مچائیں، اسی لئے تو پن چکی اُجڑ چکی تھی، اب اس کے چاروں طرف بلکہ پن چکی کے اندر بھی ڈھنگ کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، جن میں نیلراج کی نازک بیل کے چوڑے پتے اور بڑے بڑے پھول حیران نظر آتے تھے شاید وہ یہ فیصلہ نہ کر سکتے تھے کہ وہ یہاں کیا کریں کیونکہ یہاں انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر وہ کسی باغیچے میں ہوتے، کسی رہگذر پر کسی چشمے کے کنارے کسی

باڑھ میں آویزاں ہوکر مہکتے تو البتہ ایک بات تھی۔ اسی لئے وہ اُن حسین کوڑیوں کی طرح کھوئے ہوئے نظر آتے تھے جنہیں دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ شام کو البتہ میں ضرور انہیں دیکھتا تھا۔ جھاگ بلوتے ہوئے پانی کو دیکھتا تھا جس نے سورج کی کرنوں کا سارا رس کھینچ لیا تھا۔ شام کی اندوہگیں فضا میں ہولکے ہلکے ہلکے جھونکے بھی نوحہ کناں ہوتے تھے، دن بھر کی تھکی ماندی تتریاں بھنگ کی نازک تریوں سے یا تیلراج کے پھولوں سے لپٹ جاتیں، ان نریوں سے اک ہلکی ہلکی نشہ آور بُو نکلتی۔ اور تیتریاں ان پھولوں کی آغوش میں بے سدھ ہوکر سوجاتیں، میں گھاس پر لیٹ کر بہتے ہوئے سونے کو دیکھتا، تیتریوں کی غنودگی محسوس کرتے، جھینگروں اور بینوں کی جھنکار سنتا، بھر پانی کے کنارے کنارے مینڈک پھدکنے لگتے، اور آہستہ آہستہ ٹرانے لگتے یہ آہنگ، یہ صوتی تناسب، یہ مسموم فضا اکثر میری پلکوں کو اتنا بوجھل کردیتی کہ بس وہیں سوجاتا جمن نے مجھے اکثر وہیں پن چکی کے کنارے سو یا پڑا پایا تھا۔ وہ مجھے یوں سوتا دیکھکر چپکے سے اپنی گود میں اٹھا لیتا اور مجھے گھر لے جاکر بستر پر سلا دیتا۔ اور جب میں صبح اٹھتا تو یہ جان کر بہت حیران ہوتا کہ میں گھاس پر نہیں سمور سحاف کے بستر پر لیٹا ہوں۔ نہ پانی ہے، نہ پھول ہیں نہ مینڈک ہیں نہ خوبصورت تیتریاں

وہی سائیں سائیں کرتا ہوا گھر ہے۔ خاموش بڑی بڑی دیواریں، اور دادا کی لال، لال آنکھیں..... '

کبھی میں بن چکی سے بھی آگے چلا جاتا، اور گھاٹی چڑھ کر اور پرانے مندر کی شکستہ عمارت سے گزر کر اس بڑی چٹان کے پاس جا پہنچتا جو ندی کے غربی رُخ پر تھی، یہاں پر پہاڑ گویا نالے میں آگرتا تھا، عمودی چٹان تھی اور اوپر سے پانی قطرہ قطرہ ہو کر نیچے گرتا تھا۔ اس پانی میں گندھک اور چونا گھلا ہوا تھا جس سے زمین پر تکونے اور مکعب بن گئے تھے جن کی عمر کئی سو برس تھی۔ لانبے لانبے تکونے اور مکعب اس جگہ بھی لٹکے ہوئے تھے جہاں سے پانی رستا تھا، چٹان کو ہاتھ لگاؤ تو صابن کی طرح نرم اور چمکیلی معلوم ہوتی تھی۔ کائی کا رنگ کہیں پہ سبز تھا، کہیں اودا، کہیں گہرا کاسنی، یہاں پر ایک چھوٹا سا غار بھی تھا، جس کے اندر کسی نے چاروں طرف سیندور بکھرا ہے، میں اکثر سٹلوں اور چھپکلیوں کو سوتے ہوئے دیکھتا۔ کبھی کبھی ایک آدھ جنگلی خرگوش اپنے لمبے لمبے کان کھڑے کئے ہوا کو سونگھتا ہوا دکھائی دیتا اور پھر اک جھپاکے میں سفید اون کا گیند بنا ہوا فضا میں غائب ہو جاتا۔

بس یہ پن چکی، یہ رستا ہوا پانی، یہ سنگلاخ غار میری تنہائی کے رفیق تھے

ہمدم، مونس اور غم گسار تھے، گھر پر میرا جی نہ لگتا۔ اور دادا سکول کے لڑکوں سے بھی کھیلنے نہ دیتے تھے۔ گھر سے باہر بھی کسی آدمی کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ اس قدر الگ تھلگ گھر تھا وہ۔ یہ بھی پتہ نہ تھا۔ کہ گاؤں کے لڑکے مدرسے میں پڑھنے کے بعد کہاں چلے جاتے ہیں۔ کیا اُن کے گھروں میں بھی یہی پُر ہول تنہائی ہے!

ایک دن کا ذکر ہے میں دوپہر تک اپنے رفیقوں سے کھیلتا رہا۔ ان موقعوں پر درخت کا ہر پتہ، گھاس کا ہر خوشہ، جنگل کا ہر ٹڈا ہمراز بن جاتا ہے۔ اور جنگل کی زندگی اور اپنی زندگی کے وہ راز افشا کرتا ہے جو انساں کے کانوں نے اب تک نہ سُنے ہوں، جن کا ذکر ابھی تک کسی کتاب میں نہیں جو ہم خود بڑے ہو کر ہمیشہ بھول جاتے ہیں۔ اس قدر دلچسپ، مفید اور قیمتی افسانے ہوتے ہیں وہ، کاش ہم یاد رکھ سکیں، انھیں اسی ترتیب، اُسی شدتِ احساس، خلوص اور سچائی کے ساتھ دنیا پر آشکار کر سکیں جس طرح ہم نے اُنھیں بچپن میں دیکھا اور سنا تھا۔ تو شاید یہ انسانی زندگی۔۔ بدل جائے۔ یہ ساری کائنات بدل جائے، اس کا اندھاپن، اس کی تاریکی، اس کی مجبولانہ خودغرضی بدل جائے، مسرت اور حُسن اور اجیارے میں مبدّل ہو جائے

کاش انسان بچپن کے اُن افسانوں کو یاد رکھے، اُس رومانی کیف آور داستانِ حیات کو نہ بھلائے جو اس نے پانی کی کپکپاتی ہوئی کنواری بوند سے، نیلراج کی شوخ کلی سے، گھاس کے ٹکڑے کی قہقہہ آفریں کیل سے اور ہوا میں اُڑتے ہوئے خزاں کے آخری پتے سے سنا تھا۔ مینڈک اب بھی ٹراتے ہیں۔ گھاس کے ٹڈے اب بھی کھیلتے ہیں۔ نیلراج کے پھول اب بھی مسکراتے ہیں، چٹانوں سے پانی اب بھی رستا ہے۔ لیکن انسان کے کان بہرے ہو چکے ہیں۔ آنکھیں اندھی اور دماغ ماؤف ہو چکا ہے، وہ اس خرگوش اور پھول سے ہیں ۔ مار دو اور خون سے کھیلتا ہے اور دن رات روتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ کیوں روتا ہے، اس نے اپنے بچپن کے ساتھیوں سے غداری کی ہے۔ اور نہیں جانتا کہ اس کی حیات میں کس غداری کا زہر ہے اس کی آنکھ میں کس درد کے آنسو ہیں۔ اس کی روح میں کس غم کا زہراب ہے وہ اب اندھا ہو چکا ہے اور اپنی اندھی آنکھ سے جس خوفناک ہیبوں کو دیکھتا ہے۔ انھیں حقیقت کا جامہ پہنا دیتا ہے۔

گو میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں، اور دن رات بستر پر بیٹھا بیٹھا بلغم کھنگالا کرتا ہوں، اور اپنی کمزور آنکھوں اور گنجے سر کو لئے نیم غنودگی، نیم مدہوشی کی

حالت میں پڑا رہتا ہوں۔ پرسان حال کی بھی ضرورت نہیں، موت بھی نہیں چاہتا، اس لئے کہ آسمان کی نیلاہٹ اب بھی زندگی کا مزہ دیتی ہے، چمکتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر زندہ رہنے کو بھی جی چاہتا ہے، مرتے ہوئے بھی زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے، اس حرص اس ہوسِ ناتمام کا منبع معلوم نہیں۔ لیکن اس عمر میں بھی، اس نیم مدہوشی کے عالم میں بھی جب زندگی شفق کی طرح آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی ہے، مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں اتوار کے روز دوپہر تک چٹان کے رفیقوں سے کھیلتا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا مجھے بھوک لگی ہے۔ میں گھر جاتا ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد اگر جی چاہا تو پھر آجاؤنگا اور تمہارے ساتھ کھیلوں گا۔ مجھے یاد ہے، ٹڈے نے اس پر میرا مذاق اُڑایا تھا۔ اُس نے کہا تھا۔ میں تو گھاس کے خوشوں پر ناچتے ناچتے اپنا ناشتہ کرلیتا ہوں، پھول ایسے مسکرایا تھا جیسے کہہ رہا ہو میں تو کھانا کھاتا ہی نہیں۔ ہوا میں لرزتا ہوا پتہ کہہ رہا تھا۔ یہ ہوا مجھے خود غذا دیتی ہے۔ اور ایک تم ہو کہ غذا کو آگ پر بھونتے ہو، دو آدمی نوکر رکھتے ہو۔ کچن میں عجب عجیب قسم کی بوئیں پھیلاتے ہو اور پھر کہیں جا کر کھانا کھاتے ہو۔ اور کھٹی ڈکاریں لیتے ہو۔ بھئی خوب ہے تمہارا طریقہ، اور تم اپنے آپ کو ہم سے زیادہ تہذیب یافتہ سمجھتے ہو، زیادہ ترقی پسند،

زیادہ صحت مند..... ہمیں تو تمہاری عقل میں شبہ ہے! ..... آپ یقین مانئے میں نے اس عمر میں یہ سب باتیں اپنے رفیقوں سے سنی تھیں۔ اب نہیں، اب میں غدار ہوں وہ مجھ سے کبھی بات نہیں کرتے۔

خیر مجھے بھوک بڑے زوروں کی لگی تھی۔ میں وہاں سے بہ عجلت روانہ ہوا، اور پھر خدا جانے یہ کیسے ہوا کہ میں راستہ بھول گیا اور گھاٹی سے نیچے آنے کے بجائے گھاٹی کے اوپر آنکلا۔ یہ عجیب جگہ تھی، لق ودق ویران، سنگلاخ پہاڑ بے آب و گیاہ، سُرخ رنگ کی بجری چاروں طرف نظر آتی تھی، سر پر سورج چمک رہا تھا۔ اور پانی کا کہیں نشان بھی نہ ملتا تھا۔ میرے قریب شیشم کا ایک پیڑ تھا۔ جڑ کے قریب سے اس کے دو تنے ہو گئے تھے۔ ایسا گمان ہوتا تھا گویا یہ دو تنے نہیں دو آدمی اکڑوں بیٹھے ہیں اور کسی مرغی کو حلال کر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ میں اصل راستے سے بہت دور آ گیا ہوں، راستہ جو میرے گھر کو جاتا تھا بہت دور پیچھے رہ گیا ہے۔

میں نے اس درخت کا سہارا لیا، اور اس کے دونوں تنوں کے بیچ میں سے پھلانگ کر آگے بڑھا۔ یہاں پر کسی زمانے میں پتنگ کا درخت ہو گا لیکن کسی نے اس درخت کو کٹوا کر جلا دیا تھا۔ زمین میں کوئلے دبے پڑے تھے اور

یہ جگہ بھی چاروں طرف سے جلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ بٹنگ کا درخت گو جل گیا تھا۔ لیکن جڑیں پھر پھوٹ آئی تھیں۔ انھوں نے نہایت نرم نرم لچکیلی باہیں زمیں سے باہر نکال لی تھیں اور یہ شاخیں اب ہرے ہرے پتوں کے جھرمٹوں سے آباد تھیں۔

میرے لئے یہ اک نئی دنیا تھی۔ میں گھٹنوں کے بل ہو کر ان ہری ہری شاخوں کی طرف بڑھا۔ یکایک ہوا چلنے لگی، اور بٹنگ کے پتے خوشی سے رقص کرنے لگے، میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا جب ان لچکیلی شاخوں کے قریب پہنچا، تو گویا سارا جہان یکایک رخشندہ و تابندہ ہو گیا۔ کوئی رقص کر رہا تھا، پائل کی جھنکار سنائی دینے لگی، شہنائیوں کے سر اور کنواریوں کے قہقہے، یہ سب کچھ میں نے اپنے کانوں سے سنے۔ اور میں لب بھینچے ہوئے، آنکھوں میں کسی نئی دریافت کا شوق لئے ہوئے، گھٹنوں کے بل آگے بڑھتا گیا۔ مجھے اپنے قریب آتے دیکھ کر بٹنگ کی ننھی شاخیں بول اٹھیں، آؤ، آؤ، ہمارے پاس آؤ، ننھے بچے تم بھی اس خوشی، اس رقصِ جاوداں، اس کیفِ سرمدی میں کھو جاؤ ننھے بچے۔

لیکن میں اس طرح گھٹنوں کے بل چلتا ہوا شاخوں کے جھاڑ کے گرد گھومتا گیا، دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ شہنائیوں کے سُر اور کنواریوں کے قہقہے

کہاں سے آرہے ہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ اسی شاخوں کے جھنڈ کے مرکز سے نکل رہے ہیں۔

میں نے پتّوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر اندر جھانکا۔

کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ان ہیوں کے درمیان ایک کالے چمڑے کا بنا ہوا پُرانا ڈبّہ ہے جس میں سانولے رنگ کا ایک چھوٹا سا بچّہ لیٹا ہوا ہے، اُسے دیکھ کر میرے دِل کی کیا حالت ہوئی، اُسے میں ٹھیک طور پر بیان نہیں کر سکتا اس بچّے کا رنگ سانولا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھر بالے بال، آنکھیں چمکتی ہوئیں۔ لیکن وہ بھی چھوٹی چھوٹی، لیکن اس بچّے کی نگاہ تھی کہ دل میں برمے کی طرح کُھبی جا رہی تھی، اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ غم بھی نہ تھا، تجسّس بھی نہ تھا۔ بس وہ چپکے سے لیٹا تھا۔ اور جب میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں لینا چاہا۔ تو وہ نہایت اطمینان سے میری گود میں آگیا۔ اُس کا گداز بھرا بھرا جسم جو میری تشنہ روح کو سیراب کرتا چلا گیا۔ نجانے مجھے وہ بچّہ اس قدر پیارا کیوں معلوم ہوا۔ ایک عجیب بات یہ بھی ہے۔ کہ جس لمحے میری نگاہ اس بچّے پر پڑی، اُسی لمحے وہ رقص بند ہو گیا۔ وہ تنہائی کے سُر غائب ہو گئے۔ وہ قہقہے یکدم خاموشی میں مبدّل ہو گئے۔ اب وہ بچّہ میری گود میں تھا۔ اور وہ پرانا شکستہ

چمڑے کا ڈبہ اب بھی پتّوں کے درمیان پڑا تھا۔ میں نے بچّے سے پوچھا تم کون ہو؟
بچّے نے نہایت دلجمعی سے جواب دیا "میں محبّت کا دیوتا ہوں"
میں نے پوچھا۔ تم یہاں اکیلے کیسے رہتے ہو؟ تمہیں ڈر نہیں لگتا۔ مجھے تو اپنے کمرے میں ڈر لگتا ہے۔"
اس نے کہا "میں کیا کروں، مجھے یہاں اکیلا چھوڑ دیا گیا ہے"
میں نے اُسے اٹھالیا۔ اور چلنے لگا، چلتے چلتے میں نے اسے کہا۔ میں بھی اکیلا ہوں۔ آؤ ہم تم دونوں اکٹھے رہیں گے۔"
یکایک اس نے پوچھا "تمہارا گھر کہاں ہے؟"
میرا خیال ہے کہ میں اس وقت اُس کے یوں باتیں کرنے پر مطلق حیران نہ تھا۔ میں نے اس وقت غالباً یہ نہ سوچا ہوگا کہ یہ اتنا سا ننھا بچّہ کیسے بولتا ہے، میں نے اس سے پہلے اتنے چھوٹے سے بچّے کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان دنوں ایسا بچہ جماعت میں نہ تھا۔ اور اس وقت تک مجھے کسی آدمی نے یہ نہ بتایا تھا کہ اتنا ننھا سا بچّہ کبھی باتیں نہیں کر سکتا۔ اور پھر مجھ سے تو گھاس کے ٹکڑے بھی باتیں کرتے تھے۔ اس لئے یقین مانیے مجھے اس کی باتیں سن کر یا اُسے وہاں، اُس اجاڑ جگہ میں دیکھ کر کوئی خاص حیرت نہ ہوئی، مجھے اُس وقت اس امر کا کوئی

احساس نہ تھا کہ محبت کا دیوتا کوئی بڑا عجیب آدمی ہو گا۔ اُس نے کہا میں محبت کا دیوتا ہوں۔ تو میرے طفلانہ تخیل نے اس امر کو بھی اسی طرح سمجھا، جیسے اُس نے کہا ہو۔ میرا نام کریم بخش ہے، عبدالرحمان ہے!

میں نے انگلی کے اشارے سے اپنا گھر دکھایا۔ "وہ ہمارا گھر ہے۔ یہاں سے جو یہ پگڈنڈی نیچے اُترتی ہے۔ بس پگڈنڈی سیدھی ہمارے گھر کو جاتی ہے، میں اپنے دادا کے ساتھ رہتا ہوں"

اس نے کہا۔ "اوہ .. تم اپنے دادا کے ساتھ رہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ میرے ماں باپ مر چکے ہیں"

وہ بولا "میری ماں مر چکی ہے" میں نے دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگیں۔

میں نے اُسے زور سے چھاتی سے لپٹا لیا اور کہا۔ چلو ہمارے گھر چلو۔ ہم دونوں اکٹھے رہیں گے۔

اس کے لبوں تک اک محزوں ہنسی آئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا نہیں۔ میں تمہارے گھر نہیں جانا چاہتا۔ میں نہیں رہوں گا..... یہ کہہ کر وہ میرے بازوؤں سے نیچے اتر کر پھر اُسی جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ میں حیران تو

ضرور ہوا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس حیرانی میں اس حقیقت کا احساس
بھی شامل تھا کہ ہو سکتا ہے وہ واقعی میرے ساتھ رہنا پسند نہ کرتا ہو۔ میں نے
اس وقت اسے کسی پُراسرار واقع سے تعبیر نہ کیا۔ ایک نہایت معمولی بات تھی
وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ اور سچ پوچھو تو میرا جی خود اس گھر میں رہنے
کو نہ کرتا تھا۔ اچھا۔ چلو۔ ٹھیک ہے، وہ غائب ہو گیا۔ اس سے حیرت ہوئی،
لیکن پھر دل نے کہا۔ یہ کوئی اتنی عجیب بات نہیں۔ نہیں دن میں ہزاروں
ایسے افراد ملتے ہیں جو اک چھلاوے کی طرح تمہارے سامنے غائب ہو جاتے
ہیں۔ گھاس کے خوشوں میں، پن چکی کے کنارے، چٹان کی غار میں کئی بار میں
ایسے دوستوں سے مل چکا تھا۔ وہ اکثر اسی طرح خود بخود ملتے تھے اور خود بخود غائب
ہو جاتے تھے۔ لیکن آج اتنا تعجب ضرور تھا۔ کہ وہ ایک آدمی کا بچّہ تھا۔ سر سے
پاؤں تک ننگا۔ اور اتنا پیارا اور جنگل میں بالکل اکیلا۔

گھر جا کر میں نے دادا سے اس کا ذکر کیا۔ جمّن بھی وہیں کھڑا تھا۔ اور بوڑھی
ماما بھی آ کر یہ قصّہ سننے لگی۔ وہ سب لوگ چپ چاپ میری بات سنتے رہے،
میں نے دیکھا ان لوگوں میں سے کسی نے میری تردید نہ کی، میرا خیال تھا دادا
مجھے پیٹیں گے۔ لیکن وہ بھی کچھ نہ بولے۔

قدرے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔ یہ ننھا سا بچہ تم نے کہاں دیکھا تھا، وہ جگہ ٹھیک طرح سے بتاؤ۔

ارے جگہ بتانا تو میں بھول گیا تھا۔

میں نے کہا ادھر گھاٹی میں ایک جگہ ہے، جہاں سرخ بجری چاروں طرف نظر آتی ہے۔ وہاں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں۔ البتہ شیشم کا ایک درخت ہے، اور بٹنگ کا ایک جلا ہوا پیڑ جس کی جڑ میں سے اب نئی نئی شاخیں پھوٹ رہی ہیں۔

"بٹنگ کا جلا ہوا درخت" سنتے ہی میرے دادا کا رنگ فق ہوا۔ پھر وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑے۔ جمّن خوف سے دانت کٹکٹانے لگا۔ اور بوڑھی ماما ہنسنے لگی۔ ایسی خوفناک ہنسی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سنی۔ نہ پھر کبھی ایسی ہنسی سننے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

اسی رات کو بیہوشی کے عالم میں میرے دادا چل بسے، بوڑھی ماما بالکل پاگل ہو گئی۔ اور کپڑے پھاڑ کر گاؤں میں پھرنے لگی، اب میں اس گاؤں کا مالک تھا۔ نمبردار اور دیلدار بھی، جمن اب میرے کمرے میں چارپائی بچھا کر سوتا تھا کیونکہ دادا اور بوڑھی ماما کے چلے جانے سے مجھے اس گھر میں اور بھی ڈر محسوس

ہوتا تھا۔ کبھی کبھی جمن مجھے عجیب نگاہوں سے تکتا۔ پوچھتا کیا تم نے سچ مچ اس بچّے کو دیکھا تھا۔ میں کہتا اور کیا میں جھوٹ کہتا ہوں، چلو پھر کسی دن وہاں چلیں، میرا خیال ہے وہ بچہ ابھی تک وہاں ہوگا۔ اسی ٹہنگ کی شاخوں میں، تم میرے پیچھے پیچھے آنا۔ چپکے سے۔ میں اس بچّے سے باتیں کروں گا۔ پھر میں اُسے گود میں اٹھا لوں گا۔ تم دیکھ لینا اُسے۔

چنانچہ ایک دن میں اور جمن وہاں گئے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ نہ اب وہاں پتّے ناچ رہے تھے۔ نہ کسی نے مجھے خوش آمدید کہا۔ نہ ننھنائی کے سُر سنائی دیئے۔ نہ کنواریوں کے قہقہے، میں نے بار بار ریتوں کو اور شاخوں کو اُلٹ پلٹ کر کے دیکھا۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ صرف ایک طرف ریت میں دھنسا ہوا کالے رنگ کا سڑا اڈبہ تھا۔ چاروں طرف سُرخ بجری تھی اور ریشم کا درخت اور وہ سنگلاخ پگڈنڈی، جو بیچ گزرتی ہوئی میرے دادا کے گھر تک چلی جاتی ہے۔

جمن کا رنگ اُڑ گیا۔ لیکن اُس نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ چلو گھر چلیں۔

ایک عرصے کے بعد جب میں بڑا ہو گیا۔ تو مجھے بتایا گیا کہ میرے دادا کو گاؤں کی ایک کنواری سے محبت تھی، والہانہ عشق تھا۔ لڑکی حاملہ ہو گئی، اتفاق

سے دادا کو دو تین ماہ کے لئے گاؤں سے باہر جانا پڑا۔ جب واپس آئے تو پتہ چلا کہ ان کی محبوبہ کے ہاں بچّہ ہونے والا ہے، کسی نے بہکا دیا کہ یہ ان کا بچّہ نہیں ہے۔ کسی اور کا ہے، میرے دادا بڑے بدگمان تھے۔ بے حد شکی۔ ایک دن دوپہر کے وقت جب دونوں عاشق و محبوب اُسی گھاٹی پر ٹہنگ کے درخت کے نیچے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میرے دادا نے جذبۂ رقابت اور بدگمانی کے احساسات سے مغلوب ہو کر اپنی محبوبہ کو وہیں قتل کر دیا۔ وہ نمبردار تھے۔ ذیلدار اور علاقے کے امیر ترین زمیندار، اس لئے بچ گئے، کسی کو ان کے خلاف بات کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میرے دادا نے وہ ٹہنگ کا درخت بھی جلا دیا جہاں وہ دونوں ملا کرتے تھے تاکہ اس بدبخت عورت کی یاد بھی ان کے دل سے مٹ جائے ان کی محبوبہ اُسی ٹہنگ کے درخت کے تلے ماری گئی تھی، وہ محبت کا دیوتا غالباً وہی لڑکا ہوگا۔ جو اس عورت کے پیٹ میں تھا اور جو مجھے کئی برس بعد اس جلے ہوئے درخت کی شاخوں میں ملا۔ وہ محبوبہ اُسی بوڑھی ماما کی لڑکی تھی۔ جو اب پاگل ہو گئی تھی۔

وہ بھری پُری گھاٹی اُسی دن سے ویران ہو گئی تھی، وہاں گھاس تک نہ پیدا ہوتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی سے لے کر وادی کے آخری کونے تک گھاٹی کا

وہ حصّہ بالکل بے آب و گیاہ تھا۔ کس قدر تعجب کی بات ہے۔ اگر لوگ اس بات پر یقین نہیں کرتے جب میں انہیں یہ کہانی سناتا ہوں تو وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے شاید خواب دیکھا تھا۔ میں بچّہ تھا۔ اُس ٹنڈ کے درخت کی شاخوں میں سو گیا تھا۔ اور پھر اس خونیں واقع نے خود بخود میرے لاشعور میں کروٹ لی

لیکن اگر یہ سب کچھ خواب بھی ہو۔ تو بھی میں نے اسے حقیقت سے زیادہ سچا دیکھا۔ اب کیسے ان آنکھوں پر اعتبار نہ کروں۔ میں نے وہاں اُس بچّے کے علاوہ اور کسی کو نہ دیکھا۔ نہ مقتول محبوبہ کو، نہ خنجر کو، نہ جلتے ہوئے ٹنڈ کو۔ اب سوچتا ہوں شاید وہ محبّت کا دیوتا ہی تھا۔ جس نے میرے سینے سے لگ کر دادا کے سینے میں تیر پیوست کر دیا۔ کہ وہ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے میرا آج بھی یہی خیال ہے کہ بوڑھے دادا کبھی کے مر چکے تھے۔ وہ زندہ بھی تھے تو مُردوں سے بدتر، اور آج ہم میں لاکھوں کروڑوں ایسے آدمی ہیں جو ترتیب وار [illegible] اسی طرح محبّت کا خون کرتے ہیں، کسی ٹنڈ کے نیچے، کسی صوفے کے کنارے کسی گھر کی چار دیواری میں وہ ایسی محبّت کو قتل کر دیتے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ ایسا ہر ایک قتل کہیں نہ کہیں کسی [illegible] دیتا ہے۔ کسی

معصوم سانولے بچے کو اکیلا تن تنہا چھوڑ دینا۔ .. اور پھر خود بخود ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے اور وہ نہیں سمجھ سکتے کہ چاروں طرف سرخ بجری کیوں ہے۔ پانی کیوں سوکھ گیا ہے۔ ویرانی کیوں بڑھ گئی ہے۔ فضا کا ہر ذرّہ کیوں نوحہ کناں ہے ؟ یہ لوگ کچھ سمجھ نہیں سکتے، اور اندھے مسافروں کی طرح اس خشک بے آب و گیاہ سنگلاخ سڑک پر چلتے جاتے ہیں جو میرے دادا کے گھر کو جاتی ہے !

ترنگ چڑیا

اس وقت میری عمر چھ سال تھی۔ خزاں کے شروع کا موسم تھا، اور لابنی پیلی گھاس سورج کی کرنوں سے شعلہ رو دکھائی دیتی تھی۔ ماساتھوں میں بیکار رس اترنے لگا تھا اور فرشِ زمین پر چیلے کے بڑے بڑے نیلے پھول جو دور سے دیکھنے میں گراموں باجہ کا بھونپو معلوم ہوتے تھے، چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے، میں اور کنسل اور اس کی سہیلی جریا گھاس میں ٹڈے پکڑ رہے تھے، بڑے، بڑے، لمبی لمبی ٹانگوں والے ٹڈے، جو دور سے بالکل گھاس کے جوتنوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں لیکن جب اُن کی ٹانگ پکڑ لی جائے، تو پھر کس طرح پھڑ پھڑ کر کے تڑپتے ہیں، عجب تماشا ہوتا ہے اور کاسنی رنگ کی تیتریاں جو گھاس کی تریوں پر کلغی کی طرح جمی رہتی

ہیں، اور جب انہیں پکڑ کر ٹوپی کے پیچھے بند کر لیا جائے تو ہاتھوں میں ان کا کاسنی رنگ لگا رہ جاتا ہے، اور انگلی کی . . . پر اُسی طرح کے دلکش نقش و نگار بن جاتے ہیں۔

مجھے یاد ہے، ہم تینوں گھٹنوں کے بل چل رہے تھے اور گھاس کی خشک تازہ، بھینی مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور گو گھاس کی سرسراہٹ کافی بلند تھی لیکن ہم اپنی دانست میں نہایت خاموش سانس روکے ہوئے چل رہے تھے، تاکہ ٹڈوں کو ہماری آمد کا پتہ نہ لگ سکے۔ اور نہ ہی وہ ہماری آواز سُن کر بھاگ جائیں، جریا کی آنکھیں شکار کی امید میں چمک رہی تھیں، اس کے نیلے ہونٹ اندر کھنچے ہوئے تھے اور گال پھولے ہوئے، اور کنتل کے بالوں میں گھاس کے بے شمار خوشے لٹکے ہوئے تھے، جیسے کسی چڑیا نے اس کے بالوں میں تازہ تازہ گھونسلا بنانا چاہا ہو اور پھر یکایک کنتل نے ایک اونچی سرگوشی میں کہا شش

میں نے ایک انگلی اپنے منہ پر رکھ کر جریا سے کہا شش

جریا نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر کہا شش

اور پھر ہم تینوں اور زیادہ اکڑوں ہو کر چلنے لگے، کہ کہیں وہ گلابی

رنگ کی تیتری نہ دیکھ لے۔ جو ہم سے چند گز کے فاصلے پر تھی۔

یکایک ٹی ہوں، ٹی ہوں کرتی ہوئی ایک چڑیا ہمارے سامنے سے اُڑ گئی۔ چند لمحوں کے لئے اس نے فضا میں پر پھیلائے۔ گہرا لال، پیلا، اور خاکستری تین رنگوں کی خوبصورت دھنک آنکھوں کے آگے کھنچ گئی، پھر غائب ہو گئی، چڑیا نے پر سمیٹ لئے اور فضا میں ڈوب گئی، پھر وہی دھنک نکلی لال، پیلی اور خاکستری، پھر اس نے پر سمیٹ لئے، ہر بار یہ دھنک چھوٹی ہوتی گئی، آخر دُور ایک جھنڈ میں غائب ہو گئی۔

یہ ترنگ حڑیا تھی، کسنل نے ہمیں سمجھاتے ہوئے کہا وہ عمر میں مجھ سے ایک سال بڑی تھی، تم لوگوں نے شور کر کے اُسے ڈرایا ورنہ ہم اُسے پکڑ لیتے اور ایک خوبصورت پنجرے میں بند کر کے رکھتے، یہ ترنگ چڑیا تھی۔ میں نے حریا سے تہدیدی انداز میں کہا، تم نے اسے شور مچا کر اُڑا دیا" ٹی ہوں، ٹی ہوں" حریا نے نہایت شوخ و تسنگ لہجے میں ترنگ چڑیا کی نقل اتارتے ہوئے کہا، میں نے گھاس کے خوشے نوچ کر اس کے بالوں میں ڈال دیئے۔

میں وکالت کا امتحان پاس کر کے اور ٹائپ سیکھ کر ایک انگریزی فرم کے

دفتر میں سپرنٹنڈنٹ بن گیا۔ ساڑھے تین سو روپے تنخواہ ملتی تھی اور ابھی شادی
نہ ہوئی تھی، اس لئے تنہا میں جہاں چاہتا تھا وہاں رہتا تھا اکثر سینما گھر میں بسر
کرتا تھا۔ سگرٹ، شراب وغیرہ سب ہی سے تھوڑا تھوڑا شوق تھا۔ یان میں اگر
کہیں سے تھوڑی سی کوکین مل جاتی تو بے حد لطف حاصل ہوتا تھا۔ ان تمام
وارداتوں میں جو سورج چھپنے کے بعد ہوتیں، نہال سنگھ سا میرا مشیر خاص تھا،
جو ہمارے دفتر میں سکنڈ کلرک تھا اور ٹھوڑی سے نیچے ڈاڑھی منڈاتا تھا، اس
طرح کہ بھید کھلنے نہ پائے، بھید نہ کھلنے میں جو مزہ ہے، وہ بھید میں نہیں۔

ایک دن نہال سنگھ نے آہستہ سے میرے کان میں کہا وہ مال ہاتھ
لگا ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے پوچھا کتنے اونس ہوگی؟

وہ کہنے لگا کوکین نہیں، تمہیں تو عجب کوکین کی لت پڑی ہے کسی دن
جیل میں چلے جاؤ گے، یا تمہیں لقوہ ہو جائے گا۔ سب کوکین باروں کا یہی
حال ہوتا ہے۔

میں نے پوچھا، پھر، جانچے دال کی اصلی شراب منگائی ہے کیا؟ جس کا
ایک قطرہ حلق سے نیچے اترتے ہی آدمی باؤلے کتے کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا

ہے، واہ نہال سنگھ۔ تم نے تو سچ مچ نہال کر دیا۔ ایک دفعہ سالے لوائے نے پلائی تھی، بس آج شام کو رہے۔

نہال سنگھ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا "نہیں یہ بات نہیں ہے پیارے آج میرے ساتھ شام کو چلنا ہوگا۔ یہ پھر بتائیں گے ذرا یہ چھوٹے صاحب کا ڈرافٹ دیکھ لو۔"

شام کو ہم وہسکی پی کر اور ایوننگ آف برس لگا کر چلے، راستہ میں نہال سنگھ نے موتیا کے ہار بھی خرید لئے اور انھیں گول کر کے بڑے پتوں میں لپیٹ کر اپنے کوٹ کے باہر کی جیب میں ڈال لیا۔ بڑے بازار سے ہم چھوٹے بازار کو گھوم گئے، چھوٹے بازار سے نکلے، تو لال باغ کے بیچوں بیچ نکلتے ہوئے، گوالوں کی گلی میں جا پہنچے، چاروں طرف گوبر کا تعفن تھا اور گائیں بھینسیں ڈکرا رہی تھیں اور بچے شور مچا رہے تھے اور گوالے محض گالیاں بک رہے تھے اور گوالے دودھ دوہ رہی تھیں۔

گوالوں کی گلی کے پرے ایک شکستہ مسجد تھی اس کے آگے میونسپلٹی کی، لالٹین، بجلی کی نہیں، کیروسن آئیل کی، شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور لالٹین نے نئی امر اُگل دی تھی۔ اور وہ کالی سکڑی ہوئی سی کسی مردہ جانور کی زبان کی طرح ایک

طرف کو باہر لٹک رہی تھی۔ یہاں پر ایک دو منزلہ ملڈنگ تھی، شکستہ، بوسیدہ، نچلے آنگن میں گھوڑے ہنہنا رہے تھے، اور تانگے والے تاش کھیل رہے تھے۔ اوپر کے حصے میں میلے پردے، ٹیالی سرکیاں اور ٹاٹ کے بورے لٹکے ہوئے تھے، نچلی منزل سے اوپر کی منزل کو جانے کے لئے ایک لکڑی کا بوسیدہ زینہ تھا، جو قدم پڑتے ہی چیخنے چلانے لگتا تھا، لیکن ہم نے پرواہ کی۔ اور اوپر چڑھتے گئے، زینہ پر چڑھ کر نہال سنگھ دائیں ہاتھ ایک اندھیرے دالان کی طرف مڑا، اس کے آخر میں ایک کوٹھری تھی۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ دروازہ بھی صاف طور پر نظر نہ آتا تھا۔ نہال سنگھ نے دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔

میں باہر اکیلا تھا۔

ایک عرصے کے بعد جو مجھے یقیناً بہت لمبا معلوم ہوا اور جس دوران میں مجھے قتل و خون اور پستول اور چھرے اور اخبارات کی سرخیاں اور بڑے صاحب کا چہرہ، میری والدہ کی حیرت اور والد کی جوتیاں اور بہت سی خوفناک باتیں تصور میں گھوم گئیں، میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت اسی زینہ سے واپس چلا جاؤں، اتنے میں دروازہ کھلا اور نہال سنگھ بولا، اپنی بھابی سے ملو۔

میں بھابھی سے ملتا رہا۔ اس میں شک نہیں، وہ بے حد حسین، طرحدار، لیکن وہ خطرناک حد تک جذباتی تھی۔ اگر نہال سنگھ کسی دن نہ آتا تو وہ رو رو کر برا حال کر لیتی، اسے مری سے ایک لڑکا بھگا کر لایا تھا، پھر وہ ایک بوڑھے اسٹیشن ماسٹر کے پلے پڑی، جس کے گیلے پچپاتے ہونٹوں سے اُسے جلدی سخت نفرت ہوگئی اور وہ وہاں سے بھاگ نکلی۔ اسٹیشن پر نہال سنگھ نے اُسے پھانس لیا، نام تھا بیراں، عجیب نام ہے، سامنے ایک تانگے والا رہتا۔ ٹاٹ کے بورئیے کے پیچھے اس کی لڑکی مجھے گھورا کرتی۔ بیراں نے مجھے بتایا۔ موٹی اور بھدی ہے۔ مگر جوان ہے۔ پھٹی پڑتی ہے۔

اور جوانی اگر بھیڑ پر بھی آجائے، تو۔ . . . .

تو کیا ہوتا ہے، بیراں، میں نے اس سے شرارتاً پوچھا۔

وہ آزردہ ہوگئی، اس کی بھوری پتلیوں میں ایک بے قرار چمک لرزنے لگی ——

کچھ نہیں!

اور پھر بیراں نے مجھے ایک گیت سنایا۔ جس میں اس کے وطن کے صنوبروں کا ذکر تھا، وحشی جھرنوں کا اور ان تند برفیلی ہواؤں کا جن کے حلقے میں جھیلوں کے

بھنور ناچتے ہیں۔

ایک دن میں اکیلا اس کے ہاں گیا۔ اس نے پوچھا نہال کہاں ہے۔
میں چپ ہو رہا۔ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر وہ رونے لگی جب اس کے آنسو خشک ہو گئے تو میں نے اسے بتایا کہ نہال سنگھ اب یہاں کبھی نہ آئے گا، اس کا تبادلہ ایک دوسرے شہر میں ہو گیا ہے، اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس شہر میں بھجوا سکتا ہوں۔
اب کے ہیراں روئی نہیں اس کے لبوں پر ایک حزیں مسکراہٹ پیدا ہوئی، اس نے اپنے لب اتنے زور سے اندر بھینچے کہ ان میں سے لہو نکل آیا۔ لیکن وہ روئی نہیں۔ میں نے رومال سے اس کے لبوں کا لہو پونچھا اور جب لہو بند ہوا تو پھر میں نے اپنے لب اُن لبوں پر رکھ دیئے۔

بہت رات گئے۔ ہم باتیں کرتے رہے پیچھے گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ تانگے والے شراب میں مدہوش ہو کر گالیاں بک رہے تھے، ایک تانگے والا پولیس مین سے جھگڑ رہا تھا، جس کو اس نے پورا کمیشن ادا نہیں کیا تھا، اور اب وہ اس تنگ و تاریک دنیا میں اپنا کمیشن لینے آیا تھا گالیاں، گھوڑوں کی لید اور شرابی قہقہے،

س نے کہا ہیراں، میں اب چلتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں یہاں سے نکا

کے پاس ....

اس نے میرے بوٹ کے تسمے کھول ڈالے، جرابیں اتار دیں اور مجھے چارپائی پر بٹھا دیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرے پاؤں لے لئے اور انہیں اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔

میں نے کہا بیراں، میں تمہیں صدیوں سے جانتا ہوں تمہاری ہنسی، تمہاری مسکراہٹ، تمہاری نگاہوں کی شوخی سے آگاہ ہوں، ہمیشہ آگاہ رہا ہوں، لیکن کوئی چیز مجھے کہتی ہے۔

کیا کہتی ہے!

تم مجھ سے کچھ چھپاتی ہو!

کیا؟

اگر یہ بتا سکتا، تو تم سے پوچھتا ہی کیوں،

وہ بولی، زندگی میں موت کے بعد مجھے خوشی حاصل ہوئی ہے۔ بس اس خوشی کو اپنے دل میں چھپانا چاہتی ہوں، تم سے چھپانا چاہتی ہوں، سچ۔ اور کوئی بات نہیں۔

اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ تانگے والی کی لڑکی تھی، ہاتھ میں ایک پنجرا تھا۔ اسی بہانے مجھے دیکھنے آئی تھی، میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی،

بیراں دیکھو ہم ایک چڑیا لائے ہیں۔ دیکھو کتنی خوبصورت چڑیا ہے۔

بیراں نے پنجرے کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر پنجرہ ہاتھ میں لے لیا۔ ایک لال، پیلے، خاکستری پروں والی چڑیا، خاموش بیٹھی دانہ چگ رہی تھی، بڑی بھولی بھالی پیاری چڑیا تھی۔

اسے کیا کہتے ہیں، بیراں نے پوچھا۔

چڑیا! جوان بھیڑ نے جواب دیا، اور کیا؟

ٹی ہو، ٹی ہو، یکایک بیراں زور سے چلائی اور گویا میرے ذہن میں لال، پیلے، خاکستری رنگوں والی دھنک فضا میں پھیل گئی، ڈوب گئی، میں نے بیراں کا ہاتھ پکڑ لیا اور کانپتے ہوئے لہجہ میں پوچھا "جریا"؟ اس کا رنگ فق ہو گیا، ہونٹ کانپنے لگے، آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ پنجرے پر گر گئی۔

میری شادی ہونے والی تھی، میں نے اپنی شادی سے دو ماہ پیشتر جریا کو دو سو روپے دیئے اور اسے ریل میں سوار کر دیا۔ یہاں سے تو سیدھی راولپنڈی چلی جائیو،

اپنے چچا کے پاس، میں نے انہیں خط لکھ دیا ہے۔ وہ تیرا سب انتظام کر دیں گے۔ تیری شادی اچھی طرح ہو جائے گی، میں خود تیرے لئے کوئی اچھا سا گھر ڈھونڈوں گا، میں نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گئی، اور رونے لگی۔

آس پاس کی عورتوں نے پوچھا، تیری بیوی ہے!

میں نے کہا۔ ہاں!

میکے جا رہی ہے!

میں نے کہا۔ ہاں!

جریا روتی رہی، عورتیں مسکرانے لگیں۔ ایک بڑھیا بولی ہائے ہائے، عورت کی بھی کیا زندگانی ہے۔ ماں باپ پرائے ہو جاتے ہیں۔ اور پرائے مرد پر جان دیتی ہے، ہائے ہائے۔

گاڑی چلنے لگی، میں نے بڑھیا سے کہا۔ اس کا ذرا .. خیال رکھنا۔

عورتیں مسکرانے لگیں، ہائے بیٹا، اتنا کیوں گھبراتے ہو ہم بھی تو اکیلے جا رہے ہیں۔ اسے گھر پہنچا دیں گے فکر نہ کرو۔

جریا نے اپنا چہرہ پلو میں چھپا لیا۔ اور اسی طرح کھڑکی میں اپنا چہرہ

چھپائے روتی رہی حتیٰ کہ گاڑی نظروں سے غائب ہو گئی

میری بہن کنتل کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ میرے تین بچے ہیں، میں اب شراب، کوکین وغیرہ کسی چیز کا استعمال نہیں کرتا۔ شریف شہری کی زندگی بسر کرتا ہوں، دن کو دفتر جاتا ہوں، شام کو سیر کرنے جاتا ہوں رات کو چھوٹے بچے کو گود میں لے کر دیر تک اسے کھلاتا رہتا ہوں، میں خوش ہوں، میری بیوی مجھ سے خوش ہے۔ میرا خدا مجھ سے خوش ہے۔

برسوں میں خوش خوش دفتر جا رہا تھا، کہ راستہ میں مجھے ایک برقعہ پوش عورت نے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور مجھے قریب کی ایک گلی میں لے گئی، گلی میں پہنچ کر اس نے برقعہ اُتار دیا۔

چریا! یہ تمہاری حالت کیا ہو گئی۔

وہ چپ کھڑی رہی۔

تم کہاں رہی ہو،

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے کہا، یہاں کوئی دیکھ لے گا، آؤ باغ میں چلیں، میں اسے لا ل

باغ میں لے گیا، جریانے مجھے بتایا کہ چچانے اُس سے دُو سو روپے چھین لئے تھے، اور اُسے گھر سے باہر نکال دیا تھا، وہ دربدر گھومتی رہی، لیکن اس کے دل میں ایک یہی آرزو تھی کہ وہ کسی طرح واپس میرے پاس پہنچ جائے، وہ اپنے وطن واپس جانا چاہتی تھی، وہ بلا شبہ اپنے ماں باپ سے اپنے رشتہ داروں سے کبھی نہ ملے گی، لیکن وہ اپنے وطن جانا چاہتی تھی، جھوٹی محبت نے اس کی روح کو پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ تو اب نہروں کی گندی دھرتی ہیں، اس کے پہاڑوں کی اُجلی دھرتی ہی اُسے پاک وصاف بنا سکتی تھی۔

اُس نے کہا۔ ایک بار تو مجھے وہاں بھیجا دے، صرف ایک بار، پھر بس اس سرسبز دھرتی کی چھاتی سے چمٹ جاؤں گی، اور اس وقت تک نہ اٹھوں گی، جب تک وہ میرے سارے گناہ نہ چوس لے۔ مجھے ایک بار وہاں پہنچا دو۔

میں نے کہا، اس وقت مجھے دفتر جانا ہے، دیر ہو رہی ہے، کل میں تجھے یہیں ملوں گا اور سب انتظام کر دوں گا۔

۴

دوسرے دن میں نے دفتر سے چھٹی لے لی اور گھر سے باہر نہ نکلا جس دنیا میں میں رہتا تھا اس کا حریا کی دنیا سے کوئی علاقہ نہ تھا........ اس دن کے

بعد چڑیا بھی مجھے کبھی دکھائی نہ دی۔

اب ذہن میں اس کی تصویر بھی باقی نہیں، سب نقوش مٹ چکے تھے۔ ہاں کبھی کبھی پنجرے میں محبوس ترنگ چڑیا کی نی ہوں، نی ہوں، کی دردناک صدا کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ ذہن میں لال، پیلے، خاکستری رنگوں کی دھنک پھیلتی ہے۔ ڈوب جاتی ہے۔ پھیلتی ہے۔ ڈوب جاتی ہے۔ سوچتا ہوں یہ پنجرا کس نے بنایا ہے؟

نئی شلوار

پو پھٹ چکی تھی، لیکن سورج ابھی نکلا نہ تھا، بیگماں نے پہاڑ کی ڈھلوان سے جہاں گاؤں آباد تھا، نیچے ندی کی تلیٹی پر نگاہ ڈالی، دھان کی پنیری کی ایک بڑی سی تکون میں اُسے اپنا خاوند کام کرتا ہوا دکھائی دیا، اتنے فاصلے سے وہ بالکل کھلونا سا دکھائی دیتا تھا۔ اُن کھلونوں کی طرح ننھا اور خوبصورت جن سے وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی، چیڑ کے چنا ٹھوؤں اکٹھا کر کے ان میں لکڑی کی کھپچیاں آر پار پھنسا کر وہ ان کے سروں پر اخروٹوں کو کھوکھلا کر کے لگا دیا کرتی تھی اور بس کھلونے تیار ہو جاتے تھے۔ سردار اور ان کے سپاہی اور ان کی بیویاں، فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ بیویوں کی مونچھیں نہیں ہوتی تھیں۔ اور جو مرد ہوتے تھے ان کے چہروں پر

مکّی کے بھٹوں کی نرم، ریشمیں کلغیاں لگادی جاتی تھیں، اور اُسے یاد آیا کہ ایک دفعہ
اس کی گلّن سے محض اس لئے لڑائی ہوئی تھی کہ گلّن مردکھلونوں میں مکی کے بھٹّوں
کی کالی کلغیاں لگانا چاہتا تھا اور وہ سُرخ کلغیاں پسند کرتی تھی، وہ دونوں بحث
کرتے ہوئے گتھم گتھا ہو پڑے تھے، اور بیگماں نے غصہ میں آکر گلّن کا مُنہ نوچ لیا تھا۔
ہاں، اب گلّن کے چہرے پر وہ نشان نہیں تھا، گو ــــ اب گلّن اکثر اس کے چہرے
پر ایسے سرخ نشان پیدا کردیا کرتا تھا کہ جیسے پر جاتے ہوئے اُس کی سہیلیاں اُسے
چھیڑا کرتی تھیں، یہ سوچ کر اُس کے ہونٹ کاٹے ہیں، اور اُس کے رخساروں پر ہلکی سی
لالی دوڑ گئی، اسی طرح کی لالی اب مشرقی آسمان کے چہرے پر بھی دوڑ رہی تھی، جیسے
سورج نے ابھی بیگماں کا مُنہ چوم لیا تھا، بیگماں چلتے چلتے لڑکھڑا سی گئی، اور ایک پتھر
پر بیٹھ گئی اور اپنے سنہری پریشان بالوں کو سنوارتے ہوئے نیچے ندی کی تلیٹی کی طرف
تکنے لگی۔ دھاں کی سیری کا رنگ چمکیلا اور گہرا سبز تھا، ایسا سبز رنگ تو اُس نے
گاؤں کے بزاز کی دکان پر بھی نہ دیکھا تھا کہ جس کے پاس بڑے بڑے خوبصورت رنگ
والے کپڑے تھے۔ پاس ہی دیودار کے دو نازک سے چھتارے پُرغرور انداز میں آسمان
کی طرف سر اٹھائے کھڑے تھے، لیکن اُن کا رنگ بھی تو اتنا گہرا سبز نہ تھا۔ اس سبز
رنگ میں تھوڑی سی سیاہی بھی گھلی تھی۔ جیسے اُس چشمے کے پانی میں ہوتی ہو جو بہت

گہرا ہو۔ پہاڑ اور گاؤں اور وادی اور ندی سب نیند میں کھوئے گئے تھے جنگل خاموش تھے، جھرنے چپ چاپ، وہ خود بھی بہت آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی نیچے آ رہی تھی بڑے بڑے پتھروں سے بچتی ہوئی جو پگڈنڈی پر ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پتھر بھی سوئے پڑے ہیں اور انہیں جگانا مناسب نہ ہوگا، خود اس کے جسم میں بھی تو ایک ننھا سا کھلونا سو رہا تھا۔ اُس کے بچپن کی کنواری آرزوؤں کی تکمیل، یہ خیال آتے ہی وہ ڈگمگانے لگی، اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی رو دوڑنے لگی۔ یہ رَو، جس میں ندی کے پانی کی سی ملائمت، بجلی کی سی تیزی اور اعصابی حرکت کی سی فطری گردش موجود تھی۔ اس کے دھڑ اور پیٹ اور چھاتیوں میں گھومتی ہوئی دو لفظوں پر ختم ہو جاتی تھی۔ مثبت اور منفی، ۔ مثبت اور منفی، ۔ بیگماں کو اپنا سانس پھولتا ہوا معلوم ہوا۔ یکایک اُس کے کانوں میں آواز آئی، جیسے کوئی درخت کے تنے پر کلہاڑا چلا رہا ہو، کھٹ، کھٹ، کھٹ، اس نے غلط سمجھا تھا کہ وہ یا اُس کا خاوند ہی آج سب سے پہلے جاگے ہیں، گاؤں کا بوڑھا چوکیدار روشن دین ان سے بھی پہلے اٹھا تھا، اور اب ایک چیڑ کے پیڑ میں سے سنہری اور پتلی پتلی ونیاں نکال رہا تھا، کھٹ، کھٹ، کھٹ، یکایک اُسے خیال آیا کہ گھر میں تو دیا سلائی ختم ہو چکی ہے، اور آج رات کو وہ ونیوں کے بغیر آگ کیسے جلائے گی، روشنی کیسے ہو گی؟

آج رات تو اُسے ونیوں کی سنہری روشنی کی بہت ضرورت ہے، آج رات وہ ونیوں کے شعلوں کی روشنی میں اپنی نئی شلوار پہن کر دیکھے گی۔ اس کا رنگ، اس کی پھبن، وہ شلوار پہن کر اور بازو پھیلا کر گل کے سامنے ایک ناچتی ہوئی تیتری کی طرح گھوم جائے گی اور گل اُسے گلے سے لگائے گا۔ بیگماں کے لب کانپنے لگے۔ اور اُس کے چہرے پر لالی دوڑ گئی، اور وہ روشن دین کے بالکل قریب جا کر کھڑی ہو گئی، گاؤں کے بوڑھے چوکیدار نے ایک لمحہ کے لئے بیگماں کی طرف مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، وہ اپنی چھوٹی کلہاڑی کی مدد سے چیڑھ کے تنے میں سے ونیاں نکال رہا تھا۔ تنے کے جسم میں ایک گہرا گھاؤ نظر آ رہا تھا اور قریب ہی ونیوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو، بیٹی؟" روشن دین نے اُس کی طرف مڑے بغیر پوچھا۔

"نیچے، پنیری کے کھیتوں میں۔"

"گل کو میں نے صبح ادھر سے گذرتے ہوئے دیکھا تھا، شاید تیسرا پہر ہو گا، میں جب بھی ونیاں نکال رہا تھا، یہ تنا کمبخت بڑا سخت ہے۔" بوڑھے روشن دین نے کلہاڑی سے زور زور سے ٹھوکے لگاتے ہوئے کہا۔

بیگماں خاموش کھڑی رہی۔

روشن دین بولا: "اب کے دھان کی پنیری اچھی ہے، تمہارے کھیتوں

کی پنیری بھی بہت عمدہ اور مضبوط نظر آتی ہے .....گل کے ماہ کے بعد واپس آیا ہے ؟"

"تین ماہ کے بعد"

"بارہ مولے میں — کیا کرتا تھا؟ کسی لکڑی کے ٹھیکیدار کے ہاں ملازم تھا نا ؟"

"ہاں! پر یہاں دھاں کا کام سنبھالنے والا کوئی نہ تھا، دیور بیمار رہے، اسی لئے میں نے بارہ مولے چٹھی لکھ بھیجی تھی"

"تم نے اپنے دیور کو میری جڑی کھلائی تھی"

"اور بھی کئی جڑی بوٹیاں کھلا چکی ہوں، اب جو دوا بارہ مولے سے آئی ہے وہ کھلا رہی ہوں"

"اللہ فضل کرے گا.. .. لیکن تم اس وقت کھیتوں میں کیا کرنے چلی ہو؟"

"اوہ — پار والے گاؤں کے درزی کو شلوار سینے کے لئے دی تھی آج اس نے دینے کا وعدہ کر رکھا ہے" بیگماں نے کمزور، مدھم، شرمیلی آواز میں کہا۔

"اخاہ! بوڑھے روشن دین نے مڑ کر بیگماں کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔

"گل بہت اچھا لڑکا ہے......بہت اچھا لڑکا ہے.. ... نئی شلوار.. .. مجھے

یاد ہے (کھانس کر) جب میری بیوی نے ایک دفعہ مجھ سے ریشم کے کیڑے کی شلوار مانگی تھی، اور میں نے کہا تھا کہ میں تجھے سری نگر سے لا دوں گا ...... سری نگر میں میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے، اور میں ریشم کی شلوار نہ لا سکا۔ بڑی نیک بخت تھی وہ ... اُسے عمر بھر ریشم کی شلوار پہننا نصیب نہ ہوئی ..... مرتے دم تک اُس کے دل میں یہ حسرت رہی "

بوڑھے چوکیدار کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، کلہاڑی ہاتھ میں کانپ رہی تھی

بیگماں نے آہستہ سے پوچھا۔ "چاچا! میں ان میں سے تھوڑی سی وینیاں لے لوں، ہمارے ہاں آج ختم ہو گئی ہیں، اور "

"ہاں، ہاں، بیٹی، جتنی ضرورت ہوں لے جاؤ .. ۔ میں بھی آج ندی کے پار کی گھاٹی پر جاؤں گا، آج کنڈر میلہ ہے، اور سڑک پر بہت سے سیاح لاریوں اور تانگوں پر جاتے ہو۔ ئے ملیں گے اُمید ہے کہ میری سب وینیاں بک جائیں گی"

بیگماں نے وینیاں اٹھاتے ہوئے کہا "سنا ہے کہ کنڈ پر رات کو یہ سیاح لوگ وینیوں کی مشعلیں جلاتے ہیں!"

"بیٹی، اگر یہ باہر کے لوگ کشمیر میں نہ آئیں تو ہم لوگ تو بھوکوں مر جائیں۔

اللہ بڑا کارساز ہے۔"

بوڑھا پھر کھانسنے لگا، اور کلہاڑی سے کھٹ کھٹ کرنے لگا۔ بیگماں وہاں سے چلدی، ویلیوں کا گٹھا اُس نے اپنے دوپٹے میں رکھ لیا تھا، تیز قدم اُٹھاتی ہوئی وہ ندی کی تلیٹی میں پہونچ گئی۔ یکایک سورج نکل آیا، اور ساری وادی میں جیسے اک "ہلچل" سی پیدا ہو گئی، کیڑے اور ٹڈے جو شمسی لبادوں میں لپٹے ہوئے بے سدھ پڑے تھے، جاگ کر گھاس پر پھدکنے لگے، کرنوں سے چھو کر دھان کی پنیری کا رنگ اور بھی گہرا اور چمکیلا ہو گیا، اور اُس کے خوشے سمندری لہروں کی طرح کھیت کی تکوں میں ناچنے لگے، ندی کا پانی جو پہلے چپ چاپ معلوم ہوتا ہے، یکایک موسیقی سے لبریز ہو گیا، موسیقی اور پھر روشنی، نور اور نغمہ، حرکت اور زندگی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج کی کرنوں میں کوئی اضطراری قوت چھپی ہوئی ہے، جو ہر اس چیز کو بیدار کر دیتی ہے جس سے سورج کی کرنیں ہم آغوش ہو جائیں، گل نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا، اس کے سرخ چہرے پر پسینے کی لکیریں تھیں اور ہاتھوں میں دھان کی پنیری، وہ گھٹنوں تک کھیت کے پانی اور کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔ اور نہایت چابکدستی سے پنیری اکھاڑ کر اُسے بڑے کھیت میں مناسب فاصلے پر جما رہا تھا۔ بیگماں کھیت کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی، دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے،

صبح کے پہلے اجالے کا سونا اُن کی آنکھوں میں تھا۔ اُن کے دلوں میں اُن کی روح کے گوشے گوشے میں!

"بہت جلد آن پہنچی ہو، ابھی تو میں آدھے کھیت میں بھی پنیری نہیں جما سکا۔" گل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ شکوہ نہیں اظہار تشکر تھا۔ بیگماں نے مسکرا کر اور نگاہ پھیر کر پن چکی کی طرف دیکھا جو ندی کے دوسری طرف تھی، پھر اس کی مسکراہٹ نے ندی کے پرے اس اونچی گھاٹی کو چھو لیا جس کی چوٹی پر سے موٹر کی سڑک گذرتی تھی، گھاٹی کی سطح مرتفع سے گزر کر اس کی مسکراہٹ اس چوٹی پر سے بھی پرے اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلہ پر جا پہنچی، وسیع اور بسیط جنگل اور شمال کی طرف ایک چھوٹا سا گاؤں، وہ دوسرا گاؤں جس کے درزی کو گل نے بیگماں کے لئے ایک نئی شلوار سینے کو دی تھی۔ یہ مسکراہٹ گھوم کر پھر گل کے چہرے پر جا پہنچی، یہ مسکراہٹ، یہ نگاہ یہ روشنی کی کرن!

بیگماں بولی "اور واپس بھی تو آنا ہے، اب چلو گے تو بڑی مشکل سے وقت پر لوٹ سکو گے۔"

اس کی بات سنتے ہی گل نے پنیری ہاتھ سے چھوڑ دی اور کھیت سے باہر

نکل آیا اور ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنی ننگی ٹانگوں سے کیچڑ اُتارنے لگا۔

سوسی کی شلوار جس کی سُرخ زمین پر سفید چھپی پھول جھلملا رہے تھے پہن کر بیگماں بہت خوش ہوئی، بیس بائیس گز کپڑے کی شلوار ہوگی، گل کی تین ماہ کی کمائی، بیگماں نے شلوار کو درزی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اپنے خاوند کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا، کچھ پیار، کچھ غرور، کچھ شوخی، ہنس کر بولی "اور قمیص؟ چھینٹ کی لوں گی ـــــ"

گل بولا "چھینٹ کی قمیص بھی بنوا دوں گا، دو تین مہینے اور ٹھہر جا، تب تک شاید ننھے کے لئے بھی کچھ بنوانا پڑے"

بیگماں شرم سے لال ہوگئی، نگاہیں نیچی کر کے بولی "شرم تو نہیں آتی" گل مسکرانے لگا اور اس نے درزی کی طرف دیکھ کر آنکھ میچ لی۔

راستے میں سنبلو کی ایک بڑی سی جھاڑی نظر آئی جس پر نیلا دھاری کی گچھا بیل لپٹی ہوئی تھی۔ اس جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر بیگماں نے شلوار تبدیل کی چلتے چلتے وہ نیفے کی چنٹ کو سوارتی جاتی تھی، اور بیس بائیس گز کی شلوار کے گھیرے اور اس کے خوشنما پھولوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، سی شلوار نے اس کی چال میں ایک نئی نزاکت اور شعریت پیدا کر دی اور اُس کے قدموں میں مغرورانہ

سا انداز آتا گیا، پھر اُس نے ایک عجیب ادا سے، جو گل کو بہت پیاری لگی، اپنا سر گل کے کاندھے پر رکھ دیا، وہ کچھ عرصہ اسی طرح چلتے رہے، باہوں میں باہیں ڈالے وادی کا گھراوٹ میں چھپ گیا تھا۔ فرش زمین پر چیڑھ کے پیلے پیلے نکیلے جھومر بچھے ہوئے تھے اور ان کے قدموں کے مس سے ریشمین کپڑوں کی طرح سرسراتے تھے، گویا زمین نے بھی اک نئی شلوار پہن لی تھی، چیڑھ کے پیلے پیلے جھوموں کی شلوار جس پر جا بجا نشفے کے پھولوں کی گلکاری تھی، درختوں کی شاخوں پر جنگلی پرند نغمہ زن تھے، اور بادل دیودار اور چیڑھ کی چوٹیوں پر سے خراماں خراماں گزر رہے تھے، ایک پگڈنڈی وہ تھی جو جنگل کے درختوں کے اوپر تنی ہوئی تھی اور جس پر بادلوں میں رہنے والے نازک، خوبصورت اور برّاق شہزادے اور شہزادیاں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے، رخسار سے رخسار لگائے خوشی سے ناچتے ہوئے جارہے تھے، گل کا دل بھی نامعلوم مسرت سے لبریز ہو گیا۔ اُس نے آہستہ سے کہا "میں تمہیں چھینٹ کی قمیص اگلے مہینے میں سوا دوں گا، یہ قمیص اب پرانی ہو گئی ہے اور اس نئی شلوار کے ساتھ اچھی نہیں لگتی۔"

بیگماں کے نیم وا لب پھول کی پنکھڑیوں کی طرح کانپ اٹھے، اور گل نے جلدی سے انہیں اپنے سانس کی حلاوت اور ہونٹوں کی شہد آگین شبنم سے بوجھل کر دیا...

پھر وہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھ گئے، اور گل نے شوخ لہجہ میں کہا "کتنے ماہ ہو گئے ہیں؟ چار یا پانچ — ؟"

بیگماں کمزور آواز میں بولی "ہٹو بھی، تمہیں تو ہر وقت......"

گل اُسے گدگداتے ہوئے پوچھنے لگا "سچ سچ بتاؤ، چار یا پانچ؟ — چار یا پانچ؟"

بیگماں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی "ہائے — اوئی — میں مری"

گل نے اُسے گدگدانا چھوڑ دیا۔ بولا "میں بتاؤں، ایک ننھی سی لڑکی ہوگی"

بیگماں بولی۔ چھورا ہوگا، ننھی کیا تمہارے کھیت میں ہل چلائے گی؟ چھورا ہوگا، میری تو مدت سے یہی آس ہے"

گل سنجیدہ ہو کر بولا "اماں بھی یہی چاہتی ہیں"

کتنی ہی دیر تک وہ دونوں اُس جھرنے کے کنارے خاموش بیٹھے رہے، حسین آئندہ خیالوں میں ڈوبے ہوئے، چشمے کے نرم و نازک گیت، جنگل کا مسحور سناٹا، بادل رقصِ پیہم ان سب چیزوں میں انہیں اپنے مستقبل کی سنہری تصویر نظر آئی۔ اس تصویر میں اک ننھا سا بچہ بھی تھا، جو اپنی ماں کی گود میں کلکاریاں مار رہا تھا۔ ہنستے ہوئے، لڑکھڑاتے ہوئے پہلا قدم اٹھا رہا تھا، کاؤ کی سونٹی کاندھے پر رکھے بھیڑ بکریوں

نے گلے کو جنگل میں چرانے کے لئے لے جا رہا تھا' درانتی سے گھاس کاٹ رہا تھا' اپنے باپ کے شانہ بشانہ کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا' کہیں جیسے کوئی شہنائی سی بج اٹھی اور بیگماں اور گل چونک اٹھے اور مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، شاید اس تصویر کو ان دونوں نے اکھٹے ہی دیکھا تھا۔

اسی طرح آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے' ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے' بچپن اور جوانی اور آنے والی زندگی کے سیمیں لمحات میں گھومتے ہوئے ان سپنوں کو یاد کرتے ہوئے جو بیت چکے تھے' اور ان سپنوں کو دیکھتے ہوئے جو ابھی آنے والے تھے' وہ واپس موٹر کی سڑک پر آن پہونچے' سڑک پر اتنی رونق نہ تھی۔ پھر بھی کبھی اکّا دکّا لاری' تانگہ یا پیدل چلنے والے سیاحوں کی ٹولی نظر آجاتی تھی۔ گل نے بیگماں کو بتایا کہ کس طرح ان سیاحوں کی آمد سے کشمیر کے لوگوں کو ہر سال لاکھوں روپے کا فائدہ ہوتا ہے۔ سری نگر ایک بہت بڑا شہر ہے، جس کے بیچوں بیچ دریائے جہلم بہتا ہے، جس پر سات پل بنے ہیں' اور جب دھان کی فصل کٹ جائے گی تو وہ ضرور اپنی بیگماں کو سری نگر لے جائے گا' تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے ان تمام نظاروں کو دیکھ لے کہ جن کے لئے دنیا بھر کے سیّاح وہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک چنار کے نیچے چار پانچ سیّاح بیٹھے تاش کھیل رہے تھے' بیگماں اور گل ان کے

قریب سے گزرے، اور بیگماں اُن سیاحوں کے خوبصورت کپڑوں کی طرف حیرت سے دیکھتی رہی، اور وہ سیاح بیگماں کے مثالی حُسن کو دیکھ کر محو حیرت ہو گئے۔

چنار کے آگے ایک چھوٹا سا نالہ تھا۔ اُسے پار کر کے وہ گھاٹی کی ڈھلوان کے قریب پہونچ گئے، دور نیچے ندّی بہتی تھی، جس کے ایک طرف کھلونے جیسی پن چکی تھی، جس میں پانی کا جھاگ برف کے گالوں کی طرح اُڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا ندی کے دوسری طرف دھان کے کھیت تھے، جہاں گل صبح کام کرتا رہا تھا، اس سے پرے پہاڑ کے اوپر اس کا اپنا گاؤں تھا۔ سفید کوٹھے، کھریا مٹّی سے لپے ہوئے، سب کے کھلونوں کی طرح نظر آتے تھے، ان میں عورتیں نازک ننھی پتلیوں کی طرح اندر باہر جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں، سورج کی کرنوں نے گاؤں کو بھی چھو لیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی بھی پتلیوں کا تماشہ ہے۔ جن کی نازک ڈوریاں سورج کی کرنوں کے تاروں سے بنی ہیں۔

جس بلند و بالا گھاٹی پر بیگماں اور گل کھڑے تھے، اُس سے دو راستے نیچے کی طرف جاتے تھے، ایک تو سیدھا ڈھلوان راستہ ندی کی کھڈ میں جاتا تھا، اور دوسرا اتر چھا، پُرپیچ راستہ جو گھاٹی پر بل کھاتا ہو ندی کی تہ میں پہونچتا تھا۔ گل

نے کہا "میں اس چھوٹے راستے سے نیچے جاتا ہوں، اس حالت میں تمہارے لئے یہ راستہ خطرناک بھی ہے اور پھر یہاں پھسلن بھی بہت ہے، تم دوسرے راستہ سے آؤ، میں پن چکی پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

"انتظار؟" بیگماں نے چمک کر کہا "میں تم سے پہلے وہاں پہونچوں گی۔"

"ایک دفعہ پہلے بھی تم مجھ سے ایسی شرط لگا کر ہار چکی ہو" گل نے ہنستے ہوئے کہا "اب کے پھر بد کر دیکھ لو۔"

"رہی" بیگماں نے تیقن کے لہجے میں کہا "دیکھو، اگر میں پن چکی پر پہلے پہونچ جاؤں تو تمہیں کل ہی نئی قمیص کے لئے کپڑا خرید نا ہوگا، اور اگر ......"

"اور اگر ... " گل نے شرط کا دوسرا رخ بتاتے ہوئے کہا "اگر تم ہار جاؤ، تو کل دن بھر میرے ساتھ نیری کے کھیتوں میں، گھٹنے گھٹنے کیچڑ اور پانی میں — کیوں منظور ہے؟"

"منظور ہے، لیکن دیکھو دوڑنا نہیں ہوگا، بس چلنا ہوگا۔"

گل نے اثبات میں سر ہلا کر ڈھلوان کے راستے پر چھلانگ لگائی، اور تیز قدموں سے نیچے کی طرف جانے لگا۔ بیگماں ایک لمحہ کے لئے تو رکی پھر وہ بھی تیز قدموں سے دوسرے راستے پر ہولی، اب کی بار وہ گل کو ضرور شکست دے دیگی،

گل خوشی سے سیٹی بجاتا ہوا نیچے اتر رہا تھا' اُسے پورا یقین تھا کہ وہ بگماں سے بہت پہلے پن چکی پر پہونچ جائے گا، بیوقوف لڑکی' اس نے سوچا، بگماں میں ابھی تک بچپن کی شوخی اور ضد موجود ہے' یوں ہی بات بات پر جھگڑ پڑتی ہے' بھلا اس حالت میں اُسے شرط بدنی چاہئے تھی' یکایک اُس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بگماں کو آواز دے اور اُسے رُک جانے کے لئے کہے۔ لیکن دوسرا راستہ اب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا اور اُس کی آواز وہاں تک نہ پہونچ سکتی تھی' اُس کے قدم آہستہ ہو گئے' اُس نے سوچا کہ اگر وہ شرط ہار جائے' اور بگماں کو پن چکی پر پہلے پہنچ جانے دے' تو وہ شریر لڑکی کتنی خوش ہوگی۔ وہ مسکرانے لگا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شرط ہار جائے گا' وہ نہایت دھیمے دھیمے قدموں سے چلنے لگا' اور آخر ایک بڑی چٹان کے قریب جا کر رُک گیا۔ پانچ منٹ' دس منٹ' پندرہ منٹ' اس نے اپنے دل میں اندازہ لگایا' کہ بگماں اگر دھیرے قدموں سے بھی چلی ہو تو اس وقت پن چکی پر پہونچ گئی ہوگی' یہ سوچ کر وہ اٹھا اور تیز تیز قدموں سے نیچے اترتا ہوا پن چکی کی طرف جانے لگا۔ پن چکی سامنے نظر آرہی تھی۔ لیکن بگماں ابھی تک وہاں نہ پہنچی تھی' اس نے تو شرط ہارنے کی پوری کوشش کی تھی' مگر اب — یہ بگماں کا اپنا قصور تھا کہ وہ ابھی تک نہ پہونچ سکی تھی۔ یکایک اُس کے دل میں ایک خیال آیا

اور وہ مسکرانے لگا۔ شریر لڑکی، مجھے دھوکا دینا چاہتی ہے، پن چکی کی دیوار کی اوٹ میں
چھپی بیٹھی ہے۔ وہ بھاگتا ہوا پن چکی کے دوسری جانب گیا، لیکن بیگماں وہاں نہ تھی
وہ بیچاری ابھی غالباً راستے ہی میں تھی۔ گل نے ایک بار گھاٹی کے اوپر نظر دوڑائی ا
پھر اس نے دو انگلیوں کو منہ میں رکھ کر زور سے سیٹی بجائی، وہ سیٹی جو وہ بچپن میں
بیگماں کو بلانے کے لئے بجایا کرتا تھا۔

سیٹی کی آواز پہاڑوں میں گونج کر خاموش ہو گئی۔

چند لمحے اسی خاموشی میں گذرے۔ پھر گل نے زور سے آواز دی "بیگماں
پہاڑوں کے سینوں میں اک گونج سی پیدا ہوئی اور پھر وہی سناٹا
چھا گیا۔

گل کو بہت غصہ آیا، چیخ کر بولا "یہ کیا شرارت ہے؟ جواب ہی نہیں دیا
ہو، کہاں چھپ کر بیٹھ گئی ہو، بس تمہاری یہی باتیں تو مجھے دق کرتی ہیں۔ یہ کیا
مذاق ہے؟"

گل دوسرے راستے پر اوپر چڑھنے لگا۔ غصہ سے وا بس رہا تھا، ہر ا
جھاڑی کو غور سے دیکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اگر اس وقت بیگماں مجھے کسی جھاڑ
یا چٹاں کی اوٹ میں دبکی ہوئی مل جائے تو ـــــ

ایک بڑا سا پتھر اوپر سے لڑھکتا ہوا اُس کی طرف آیا، وہ فوراً ایک طرف کو سرک گیا، بس چند لمحوں کا فرق رہا، ورنہ اُس کا سر یا ٹانگیں زخمی ہو جاتیں۔

"بیگماں"، اُس نے چلّا کر کہا، "یہ کیا حماقت ہے؟"

آٹھ دس پتھر ایک دم نیچے لڑھکتے ہوئے آئے، اُس کا پاؤں پھسل گیا اور گھسٹتا ہوا نیچے ندی میں جا گرا، اُس کے ہاتھ پاؤں زخمی ہو گئے اور ماتھے سے خون نکل آیا۔

اُس نے چلا کر کہا، "بیگماں ــــ بیگماں ــــ"

دوسرے راستے کے درمیانی حصے میں ایک موڑ کے قریب جہاں انجیر کا درخت اُگا تھا، اور گھنی جھاڑیاں تھیں اُسے دو آدمی دکھائی دیئے، اُن کی ٹانگیں ننگی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھر اُٹھائے ہوئے تھے۔

گل کا جیسے کسی نے گلے پکڑ لیا ہو، اُس کے خون کی روانی رُکنے لگی، اس کی آنکھوں کے آگے شرارے ناچنے لگے، وہ بھاگ کر راستے پر اوپر چڑھنے لگا لیکن اب ان جھاڑیوں کے پیچھے سے تیسرا آدمی نمودار ہوا، اور پتھروں کی جیسے بارش شروع ہو گئی۔ گل نے پہچانا، یہ وہی سیاح تھے۔ جو تھوڑی دیر پہلے گھاٹی کے اوپر چنار کے نیچے تاش کھیل رہے تھے۔ ایک بہت بڑا پتھر تیزی سے نیچے لڑھکتا ہوا آیا،

اور اپنے ساتھ گل کو دھکیلتا ہوا لے گیا۔

گل ندی کے کنارے گر گیا، اُس کا گلا رندھ گیا تھا، اور اب وہ سرگوشیوں میں چلّا رہا تھا، گھاٹی کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے التجا کر رہا تھا۔

"خدا کے لئے ــــ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ــــ خدا کے لئے ــــ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ــــ نہیں خدا کا واسطہ ــــ اپنی بیوی بچّوں کا واسطہ اللہ رسول کا واسطہ ..... "

اور اوپر جھاڑیوں کی اوٹ میں سے جو تھا آدمی نمودار ہوا، اس کی ٹانگیں ننگی تھیں اور اُس کے ہاتھ میں سُوسی کی نئی شلوار تھی۔

گل نے اُٹھنے کی کوشش کی، اس کے ہاتھوں نے آس پاس کے پتھروں کو اپنی ہتھیلیوں میں پکڑنے کی کوشش کی، لیکن پتھر اُس کے لہو سے سُرخ ہو چکے تھے اور اس کی ہتھیلیوں میں سے پھسلتے گئے، اور وہ ندی کے کنارے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ یکایک چھیپی سوسی کی نئی شلوار ایک ہوائی چھتری کی طرح بل کھاتی ہوئی اُس کے سامنے آن پڑی اور پتلی پتلی سنہری دھنیاں پتھروں پر بکھر گئیں۔

پرماتما

پرماتما کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں، اس نے خشمگیں نگاہوں سے سورگ کے بڑے پجاری کی طرف دیکھ کر کہا۔ موضع ہمیر پور میں پاسی کسان اور اس کا کنبہ کئی دنوں سے فاقے کر رہا ہے۔ اور تم نے ابھی تک اس کے لئے کچھ نہیں کیا؟

بڑا پجاری تھر تھر کانپنے لگا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ پربھو۔ میں نے تو بہتیری کوشش کی ہے، لیکن کیا کروں اُس بیچارے کی قسمت ہی ایسی ہے۔ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔

کیسے نہیں ہوتی۔ پرماتما نے اپنے نورانی عصا کو فرش پر ٹیک کر کہا اور

تمام کائنات میں نور کی بارش برس گئی۔ چلو ہم دیکھتے ہیں۔ پاسی کسان ہمارا بھگت ہے۔ وہ ہر وقت ہمیں یاد کرتا ہے۔ یہ ہمارا دھرم ہے کہ ہم مصیبت کے وقت اُس کی مدد کریں۔

ست بچن پربھو۔ بڑے پجاری نے ماتھا ٹیک کر کہا۔

پاسی کساں نے دروازہ کھولا۔

بڑے پجاری نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ یہ پرماتما ہیں۔

پاسی کسان پرماتما کے چرنوں میں گر پڑا۔ میرے دھرم، میری عزت کے مالک، مجھ پر ترس کھائیے۔ دو دن سے بچے بھی بھوکے ہیں۔ اِن کا بلکنا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اپنے بھگت کو آسرا دیجئے۔

پرماتما نے پوچھا۔ تمہارے پاس اناج تھا وہ کیا ہوا۔

بڑے پجاری نے کھاتہ دیکھ کر کہا۔ تمہارے پاس دس بیگھے زمین ہے۔ اس سال ہم نے بارش بھی اچھی مقدار میں منظور کی تھی۔ وہ سب کی سب تمہاری زمیں میں پڑی۔ اس کھاتے میں اس بارش کا سارا حساب درج ہے۔ امسال بجٹ میں ہم نے قحط بھی نہیں رکھا۔ صرف کسانوں کی بہبودی کے لئے۔ تاکہ انہیں کسی قسم کی

شکایت نہ رہے۔ اس پر بھی تم کہتے ہو کہ تم بھوکے ہو۔

کسان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بھگوان۔ میرے پاس تھوڑا سا اناج بچا تھا، وہ بھی بنیا اٹھا کر لے گیا۔

پرماتما نے اپنا نورانی عصا فرش پر مارا اور زمین خوف سے لرز اٹھی۔ کئی جگہوں پر زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوئے۔ اور ہزاروں مٹی کے گھروندے گر پڑے۔ پرماتما نے خشمگیں نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر کہا۔ پجاری۔ ہمیں اس بنئے کے گھر لے چلو۔

جو آگیا! بڑے پجاری نے ہاتھ جوڑ کر ماتھا ٹیک کر کہا۔

بنیا گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔

بڑے پجاری نے کہا۔ آپ پرماتما ہیں۔

جی، بنئے نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔ ہی ہی ہی، چیونٹی کے گھر بھگوان آئے ہیں، میں غریب بھوکا بنیا بھلا کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ مگر پھر بھی جو کچھ ہے بھگوان کا دیا ہے۔ آئیے! اندر تشریف لائیے۔

چند لمحوں میں پرماتما کے ارد گرد بنئے کے بچے بالے جمع ہو گئے۔ اور ناچنے لگے،

ایک بچّہ کندھے پر چڑھ بیٹھا۔ اور ایک نے جیبیں ٹٹولنی شروع کردیں، تاروں کے جواہر، شبنم کے موتی۔ چاندنی کی چاندی۔ سورج کا سونا۔ سب کچھ جیبوں میں سے نکال لیا۔ اور پھر اپنی ماں کی جھولی میں ڈال دیا۔

بنئے اور اس کی بیوی نے بھگوان کو آسن پر بٹھایا۔ اور گلے میں ہار ڈالے۔ پھر بولے۔ بھگوان ہم آپ کے لئے اس گاؤں میں ایک سہ منزلہ دھرمشالہ بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم گریب ہیں۔ ہمیں اتنا دھن دیجئے۔ کہ ہم ——۔

یکایک پرماتما کی آنکھیں یاقوت کی طرح چمکنے لگیں۔ انھوں نے غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں بنئے کو ٹوک کر کہا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم نے پاسی کسان کے گھر سے اناج اٹھوا لیا۔ اب وہ بے چارہ بھوکا مر رہا ہے۔

بنئے نے ڈنڈوت کی۔ اور زمین پر سر رکھکر بولا۔ میرے پاس جو کچھ ہے بھگوان کا ہے۔ لیکن ایک عرض ہے۔ کہ پچھلے سال جب قحط پڑا تھا۔ میں نے پاسی کسان کو چار من گیہوں قرض دیا تھا۔ وہ قرض بمع سود چکانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے رضامند کیا۔ اس نے اپنی مرضی سے مجھے اناج دیا ہے مہاراج۔

چار من گیہوں پر سود کتنا لگتا ہے؟ پرماتما نے پوچھا۔

صرف چار من، بھولے بادشاہ اے بھگوان۔ دیالو! صرف چار من!

پرماتمانے بڑے پجاری کی طرف دیکھا۔ اس نے کھاتہ کھول کر ورق گردانی کی۔ پھر بولا۔ اتنا سود جائز ہے۔ کھاتہ میں بھی لکھا ہے۔

بنئے نے خوش ہو کر کہا۔ میں تو بھگوان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ البتہ وہ جو گاؤں کا زمیندار ہے۔ وہ بڑا ظالم ہے۔ کسانوں کو بہت پریشان کرتا ہے زبردستی اناج ہتھیا لیتا ہے۔

پرماتمانے بڑے پجاری کو حکم دیا۔ زمیندار کے گھر چلو۔

بنیا گڑگڑا کر کہنے لگا۔ اور حضور وہ میری سہ منزلہ دھرمشالہ . . . . .

زمیندار کے گھر مجرا ہو رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔

آئیے۔ پرماتما جی! یہاں اس کرسی پر بیٹھئے۔ اس کرسی پر میرے قریب بیٹھئے میں نے جے پور سے نئی طوائف منگائی ہے۔ اس کی کمر کا لوچ دیکھئے۔ اس کا نرت۔ ہائے ہائے۔ بڑے دنوں کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی۔ میں بچپن میں ایک دو بار اپنی ماں کے ہمراہ مندر گیا تھا۔ ہنس کر آپ کی صورت تو اب پہچانی بھی نہیں جاتی۔ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا۔ کہ مندر میں آپ کی نئی مورت بنواؤں، لیکن کیا کروں۔ جنگ کی وجہ سے اخراجات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ، بہرحال

اگلے سال میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے سال ضرور آپ کی ایک نئی مورت مندر میں براجماں ہو گی۔

پرماتما نے کہا۔ ہم وہ پاسی کسان ۔۔ ۔۔۔

ہئے، ہئے، کیا ادا ہے۔ زمیندار نے ناچنے والی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پرماتما نے بڑے پجاری کی طرف گھور کر دیکھا۔ لیکن وہ بھی ناچ دیکھنے میں اس قدر منہمک تھا کہ اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ ناچار پرماتما کو پھر کہنا پڑا۔

وہ اُس پاسی کسان کے متعلق ہم ۔۔۔

اجی آپ کس کمینے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ تو سالا بڑا بدمعاش ہے۔ وہ زمین دراصل میرے باپ کی تھی۔ دس بیگھے زمین جس میں وہ اب کاشت کرتا ہے۔ میرے باپ نے خوش ہو کر اس کے نام کر دی تھی۔ اور دیکھا جائے تو میرے باپ کو کیا حق تھا کہ موروثی جائداد ایک غریب کسان کے نام لکھ دیتا۔ یہ سراسر خلاف قانون تھا، وہ تو یوں کہیے۔ کہ میں ذرا آپ کا بھگت ہوں۔ میں صرف اپنا حصہ لے لیتا ہوں، اناج میں سے۔ صرف ایک تہائی لیتا ہوں۔ ورنہ دیکھا جائے تو وہ زمین ہماری ہے۔

پرماتما نے پجاری سے کہا۔ کھاتہ دیکھو!

ہیں؟ بڑا پجاری ابھی تک ناچنے والی کی طرف تک رہا تھا۔

پرماتمانے چڑ کر کہا۔ کھاتہ دیکھو۔ یہ زمین کس کی ہے۔

بڑے پجاری نے کھاتہ دیکھ بھال کر کہا۔ زمیندار سچ کہتا ہے۔ زمین کا مالک وہی ہے۔

زمیندار نے کہا۔ دیکھا بھگوان۔ آپ کا داس بھلا جھوٹ کاہے کو بولنے لگا۔ ارے آپ تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ذرا گانا سنئے۔ ارے بھئی متو، ذری بھاگ کر پان بنوا لانا۔ وہ ذرا ... ۔ اِدھر نہ جائیے گا حضور۔ اُدھر پردہ ہے۔ ہاں۔ یہ راستہ ہے، دراصل میں خود چاہتا ہوں کہ کسانوں کی مدد کروں۔ لیکن کیا کروں صاحب لگان اس قدر ہے۔ اس قدر ہے۔ کہ توبہ ہی بھلی۔ الائچی لیجئے۔ ذرا ریاست کے حاکم سے تو ملئے۔ اگر وہ لگان کچھ کم کر دے تو ساری مشکل ابھی حل ہو جائے۔

چپراسی نے کہا۔ آپ اس پرچے پر اپنا نام۔ پتہ اور کام لکھ دیجئے۔ صاحب اس وقت سر پھرا اٹھا کر جکر جی سے باتیں کر رہے ہیں۔

چپراسی پرچہ لے کر اندر گیا تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔ بولا۔ صاحب بولے ہیں پانچ منٹ بیٹھو وہ ابھی فارغ ہوتے ہیں۔ صاحب نے بڑے پجاری صاحب کو بھی سلام بولا ہے۔

پانچ منٹ کے بعد پیشی ہوئی۔

ریاست کے حاکم نے بڑی معذرت کی۔ دراصل سر بھرا ٹامکر جکر جی سے ملاقات کا یہی وقت طے ہوا تھا۔ اس لئے انتظار کرنا پڑا۔ ورنہ..... معاف کر دیجئے گا۔ میں تو آپ کا اور اپنی رعایا کا خادم ہوں۔

پرماتما نے کہا۔ پاسی کسان بھوکا ہے۔ آپ لگان بہت زیادہ لیتے ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے۔

دیکھئے۔ دیکھئے۔ طیش میں نہ آیئے۔ حاکم نے نہایت نرمی سے کہا' مجھے ریاست کا نظم ونسق چلانا ہے۔ اس کے لئے روپیہ چاہئے۔ روپیہ کہاں سے آئے اگر میں کسانوں سے لگان وصول نہ کروں۔ آج کل کی اردگرد کی سب ریاستیں ہماری دشمن ہو رہی ہیں۔ اس لئے اسلحہ جات کے کارخانوں کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑا ہے۔ ان تمام اخراجات کو پورا کرنے کے لئے لگان بڑھا دیا ہے۔ اس میں آخر پاسی کسان ہی کا فائدہ ہے۔ ورنہ اس کی یہ رمن۔ یہ دس بیگھے زمین دوسری ریاستوں کے قزاق چھین لیں گے۔

بڑا پجاری بولا۔ حاکم ٹھیک کہتے ہیں۔

حاکم بولا۔ میں تو ہر وقت آپ کے تابع ہوں لیکن ذرا یہ تو سوچئے۔ کہ کیا

یہ میرا دھرم نہیں کہ میں اپنی ریاست کو دوسری دشمن ریاستوں کی دست برد سے بچاؤں۔

بڑا پجاری بولا۔ حاکم ٹھیک کہتے ہیں!

چوبے جی مندر کے دروازے پر بیٹھے ہوئے بھنگ گھوٹ رہے تھے۔ مندر کے چاروں طرف پھلدار درختوں کا باغ تھا۔ اور باغ سے ملحق پانچ ایکڑ زمین جس میں اناج۔ سبزی ترکاری سب کچھ ہوتا تھا۔

پرماتما نے کہا۔ یہ اناج تم پاسی کسان کو دے دو۔

چوبے نے بھنگ کا لوٹا چڑھاتے ہوئے کہا۔ باؤلے ہوئے ہیں آپ، یہ اناج یہ پھل پھلاری تو بھگوان کی بھینٹ ہے۔ اور جو چیز ایک دفعہ بھگوان کی بھینٹ ہو جائے اُسے کوئی دوسرا آدمی کیسے کھا سکتا ہے۔ کیا آپ پرماتما ہو کر اتنا بھی نہیں جانتے۔

پرماتما نے بڑے پجاری کی طرف دیکھا اور بڑے پجاری نے پرماتما کی طرف، پھر بڑے پجاری نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔ چوبے جی ٹھیک کہتے ہیں۔ کھاتے میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

شام کو تھکے ہارے دونوں ساتھی پاسی کساں کے دروازے پر واپس پہنچ گئے۔ پاسی کے گھر کے اندر سے شیون کی صدا بلند تھی۔ چھوٹا لڑکا بھوک سے نڈھال ہو کر مر گیا تھا۔

اور کسان کی بیوی دو ہتڑ چھاتی کوٹ رہی تھی۔

پاسی کسان نے پوچھا۔ اناج لائے ؟

پرماتما نے سر جھکا لیا۔

بڑا پجاری بولا۔ صبر کرو۔ پاسی کساں۔ صبر کے سوا اور کیا چارہ ہو سکتا ہے۔

ہائے میرا لال ہائے میرا ننھا مونی ......

یکایک پرماتما کا چہرہ مسرت سے روشن ہو گیا۔ اس نے سر اونچا کر کے کہا۔ پاسی کساں آؤ۔ ہم تمہیں اور تمہارے سارے کنبے کو سورگ لئے چلتے ہیں۔

پاسی کسان بولا۔ وہاں کھانے کو کیا ملے گا۔ ؟

پجاری نے کہا۔ وہاں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ وہاں صرف پرماتما کا نور ہے!

پاسی کسان نے تلخی سے کہا۔ پرماتما کا نور تو یہاں بھی ہے۔ اور یہ کہہ کر اس نے دروازہ زور سے بند کر لیا۔ اور پرماتما اور بڑا پجاری حیران و پریشان باہر کھڑے رہ گئے۔

جب، وہ دونوں آسمانوں اور کائناتوں سے گزر کر اپنی جگہ پر واپس آگئے۔ تو بڑے پجاری نے چپکے سے پرماتما کے کان میں کہا۔ دیکھا آپ نے۔ یہ کسان کتنے ناشکرے ہیں۔ سورگ میں بھی آنا نہیں چاہتے۔

پرماتما نے غضبناک لہجے میں کہا۔ دفع کرو، جہنم میں ڈالو سب کو!

بڑے پجاری نے مسکرا کر کہا۔ اس کا میں نے پہلے ہی سے بندوبست کر دیا ہے!

خوشی

وہ کہنے لگا۔ نوکر تو نہیں البتہ ایک کمائی کا ضرور بندوبست کرسکتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ آئندہ سٹہ میری معرفت کھیلا کریں۔

میں نے کہا۔ تم تو مذاق کرتے ہو۔

وہ بولا۔ جی نہیں۔ مذاق اور آپ سے! سچ کہتا ہوں مجھے کمیشن ملتا ہے سٹے باز جو رقم داؤ پر لگاتے ہیں اس پر مجھے پانچ فی صدی کمیشن ملتا ہے اس دفتر کے سب ملازم میری معرفت ہی سٹہ کھیلتے ہیں۔ ورنہ آپ ہی بتائیے کہ جو تنخواہ مجھے یہاں ملتی ہے اس میں کسی بھلے مانس کا گزارہ کیسے ہوسکتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ اس کی عمر کتنی ...... کیا...... گے ..... ؟.....

بیس برس کے تجزونے مجھے بوکھلا دیا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ جی نہیں کوئی چودہ پندرہ برس کی ہو گی۔ رنگ نہ گندمی نہ سانولا۔ بس بیچ کا رنگ، جیسے فاختہ کے سینے کا ہوتا ہے۔ بس آپ اسے ایک فاختہ ہی سمجھئے۔

میں نے کہا۔ میں شکاری نہیں ہوں۔ مجھے تو نوکر چاہئے۔

وہ بولا۔ وہ کھانا پکانا سینا پرونا سب جانتی ہے۔ پھر آپ اکیلے ہیں وہ آپ کے گھر کا سب کام سنبھال لے گی۔

مگر بھئی نوکرانی! لوگ کیا کہیں گے۔

وہ ہنسا۔ آپ کی آزاد خیالی تو دفتر بھر میں مشہور ہے۔ اور آپ تو لوگوں کو اخلاق کا سبق دیتے ہیں۔ اور اشتراکی بنا ناپسند کرتے ہیں، دیکھئے نا اگر اب آپ بھی ......؟ اور پھر وہ بے چاری یتیم ہے۔

یتیم ہے؟ میں نے ترس کھاتے ہوئے پوچھا۔

جی اس کے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ وہ اب تک اپنے چچا کے پاس تھی۔ جب وہ تیرہ برس کی ہوئی تو چچا نے اس پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔

تمہارا مطلب ہے۔ اُس کے دامنِ عصمت ۔۔۔۔۔

جی ہاں اس کے دامنِ عصمت کو پارہ پارہ کرنا چاہا۔ اُس کی زندگی کی متاعِ عزیز کو لوٹ لینا چاہا۔ اس کی دوشیزگی کی معصومیت کو اپنی رندی و ہوسناکی کا شکار بنانا چاہا۔ اس کی باکرہ روح کی مقدس عفت کو اپنی بہیمت و شیطنت ۔۔۔"

میں نے کہا۔ "اس بکواس کو ختم کرو۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔"

وہ بولا۔ جی۔ دیکھئے نا۔ لوگ سچائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ زنا بالجبر کہہ دینا گناہِ عظیم ہے۔ دفتر کے بڑے بابو بھی کہتے ہیں۔ اور پھر میں مترجم ٹھہرا۔ جو وہ کہتے ہیں۔ اُسی طرح کام کرتا ہوں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں نے اس فعلِ شنیع کو اپنی زبان میں ادا کرنے کے لئے ایک سو ایک فقرے یاد کر رکھے ہیں۔ دفتر کے بڑے بابو کہتے ہیں۔ کہ سچائی کو عریاں صورت میں کبھی پیش نہ کرنا چاہیئے بلکہ ہمیشہ لباس پہنا کر۔

میں نے کہا۔ مگر ذکر تو نوکرانی کا ہوا تھا۔

وہ بولا۔ جی نہیں۔ ذکر اس کے چچا کا ہوا تھا۔ جس نے اس پر ہات صاف یعنی میرا مطلب ہے۔

میں نے جلدی سے کہا۔ میں سمجھ گیا۔ آگے چلو۔

تو وہ اپنے چچا کے گھر سے بھاگ نکلی۔ اور اپنی موسی کے گھر آگئی۔ یہاں پر موسی نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اسے اچھے کپڑے پہنائے، دو چار اپنے زیور نکال کر اسے دیدیئے۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا۔ اُسے اپنے سینے سے لگایا'
کیوں جی جب عورت، عورت کو سینے سے لگاتی ہے۔ تو اُس سے عُریانی تو نہیں پیدا ہوتی۔؟

میں نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ بڑے بابو نے کسی لفظ کے غلط ترجمے پر تمہیں ڈانٹ پلائی ہے۔ بہر حال۔ ...... خیر۔. .... آگے بڑھو! تو صاحب وہ بولا۔ لڑکی بالکل نوجوان تھی۔ اور اس کی موسی کا خاوند ذرا ـــــ آں.. میرا مطلب ہے کہ ذرا وہ" تھا۔ چنانچہ وہ" بھی لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ موسی کا خاوند اور موسی کا بیٹا دونوں اس پر عاشق ہوگئے۔ یعنی باپ اور بیٹا دونوں بیک وقت ....

پھر کیا ہوا؟

ہوتا کیا۔ موسی نے دو طمانچے لگا کر لڑکی کو گھر سے نکال دیا۔ اب وہ اپنے پھوپھا کے گھر پہنچی۔ پھوپھا ذرا شریف قسم کا بدمعاش تھا۔ یعنی اُسے بڑے دم دلاسے دے کر اپنے گھر رکھا۔ اکیلا تھا وہ آپ کی طرح۔ چنانچہ جہاں اور لوگ کامیاب نہ

ہوئے وہ کامیاب ہوگیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اُس نے لڑکی کو پیشہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

پیشہ کرنے پر؟

جی ہاں۔ آپ کو اس کا مطلب سمجھاؤں۔ یعنی اُس لڑکی کو مجبور کر دیا گیا۔ کہ وہ چند روپہلی ٹکلیوں کے عوض اپنی عصمت و عفت کو، اپنی تقدس مآب حیا پرور دوشیزگی یعنی اس متاعِ عزیز، خزینۂ حیات......"

خدا کے لئے۔ میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مجھے تمہارے ترجے سے کوئی سروکار نہیں۔

وہ مسکرایا۔ بولا۔ مجھے شبہ ہے کہ آپ عریاں پسند ہوتے جاتے ہیں۔ خیر، مجھے آپ کی عریاں پسندی سے کیا سروکار۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اس شریف بدمعاش پھوپھا نے اس بدقسمت لڑکی کو بازار کی فاحشہ بن جانے پر مجبور کر دیا۔ چند ہفتے اسی طرح گزرے۔ پھر وہ بیمار ہو گئی۔ سوزاک!

سوزاک؟ میں نے گھبرا کر کہا۔

وہ چڑ کر بولا۔ آپ بدکتے کیوں ہیں۔ کس شہر میں۔ کس گلی میں۔ ہندوستان کے کس گاؤں میں آپ نے اس کا نام نہیں سنا۔ زندگی کے کس نکڑ پر آپ نے اس منحوس بیماری کا نام نہیں سنا۔ کیا کبوتر کے آنکھیں بند کرنے سے باز حملہ نہیں کرتا

کیا وہ اشتہار آپ نے نہیں دیکھے "پیپ جلن دو دن میں بند" وہ کون مکان ہے۔ کون سا شہر ہے۔ کون سا گاؤں ہے۔ مندر سے لے کر غریب کی جھونپڑی تک وہ کون سی دیوار ہے ...... ؟ جہاں اس خوفناک بیماری کی پیپ اور جلن کو دو دن میں بند کر دینے کا ذکر نہ ہو، وہ کون سا شریف گھر ہے ؟......

میں نے کہا۔ اب تم گالی دینے پر اتر آئے ہو۔

چلئے نہ سہی۔ سوزاک نہ سہی۔ یہ سمجھ لیجئے۔ اسے ایک "خوفناک شرمناک بیماری" لاحق ہو گئی۔ گو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اسے کس کے لئے شرمناک کہا جائے۔ اس لڑکی کے لئے۔ یا اُس شریف سماج کے لئے۔ جو اُس سے دن رات پیشہ کراتا ہے

میں نے کہا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے یہ وعظ سننا پڑے گا۔

وہ بولا۔ معاف کیجئے گا۔ واقعی میں بہت باتونی ہوں۔ جھکی ہوں.... مختصر بیاں کرتا ہوں...... تو صاحب اب وہ لڑکی وہاں سے بھاگ نکلی پھوپھا اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ وہ دونوں لڑنے لگے۔ لڑکی چیخنے لگی۔ اتفاق سے میں سڑک پر گزر رہا تھا۔ ادھر دفتر آتا تھا۔ بغل میں فائل دابے......،

ہیرو ہو گئے تم ! میں نے طنزاً کہا۔

"جی نہیں" اُس نے کہا۔ بھلا دفتر کا مترجم کبھی ہیرو ہو سکتا ہے۔ بھلا چالیس

روپے تنخواہ پانے والا کبھی ہیرو ہو سکتا ہے؟ ..... ہاں تو صاحب میں اُسے اُس کے پھوپھا سے چھڑا کر اپنے گھر لایا۔ یہاں میں اپنے بڑے بھائی اور بھابی اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں رہتا ہوں۔ وہ لوگ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بھابھی نے میری شرافت کو سراہا اور اس لڑکی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ لیکن صاحب اس لڑکی کی قسمت ہی بُری ہے۔ میں اگر اس لڑکی سے دو باتیں بھی کر لوں تو بھابی خفا ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ لڑکی کبھی میرا بستر بھی ٹھیک کر دے تو آگ بگولہ ہو جاتی ہیں اب گھر میں ہر وقت چخ سی رہتی ہے۔ سکون تباہ ہو گیا ہے۔ لڑکی کے علاج پر میں نے چند روپے صرف کر دیئے۔ لیجئے اب تک گالیاں پڑ رہی ہیں۔ بھابی نے آج لڑکی سے کہہ دیا ہے کہ جہاں اس کا جی چاہے چلی جائے۔ میں اُسے گھر پر نہیں رکھ سکتی۔

تو اس لئے تم اُسے میرے ہاں بھیجنا چاہتے ہو۔ ایک بدمعاش عورت کو میرے ہاں ملازم کرانا چاہتے ہو۔ میں نے غصے سے کہا۔

اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ بولا۔ مجھے آپ کے معصوم چہرے اور گنجے سر نے دھوکا دیا۔ میں سمجھتا تھا۔ آپ کو غریبوں سے ہمدردی ہے۔ آپ محض مانیں ہی باتیں بناتے ہیں یا ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔

مگر وہ لڑکی؟ ...... میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ بیمار ہے۔ آسوزک ہے۔ میں اُسے کیسے؟ میں خود بیمار ہو جاؤں گا۔ تم سمجھتے نہیں ...... یہ چھوت کی بیماری ...... اور ...... ذرا سوچو تو ......!

سُنیئے۔ اب وہ اچھی ہے۔ میں نے اسّی روپے صرف کئے ہیں اس کے علاج و معالجے پر، دیکھئے۔ آج بھابھی اُسے گھر سے نکال دیں گی۔ میں اسے پھر قحبہ خانے کے جہنم میں واپس نہیں بھیجنا چاہتا۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اور میری تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہے کہ میں اُسے ایک الگ مکان لے کر دوں۔

ایک الگ مکان؟ میں نے حیراں ہو کر کہا۔

وہ بولا۔ ہاں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

(۲)

چاند میرے گھر نوکرانی بن کر آگئی۔

میں نے کہا۔ چاند

وہ بولی۔ جی!

دیکھو۔ میری عمر پینتیس سال سے کچھ زیادہ ہے۔ میرا سر گنجا ہو چکا ہے۔ میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ میں عورتوں سے دور بھاگتا

ہوں۔ ساڑھے تین سو روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ لوگ مجھے ازلی شریف سمجھتے ہیں میری شرافت میں بٹہ نہ لگانا۔ مجھے زیادہ پریشان نہ کرنا۔ بال سنوار کر آنکھوں میں کاجل لگا کر مجھے دعوتِ نظّارہ نہ دینا۔ بس چپکے سے گھر کا کام کاج کرتی جاؤ۔ پندرہ روپے تنخواہ اور روٹی کپڑا۔

وہ بولی۔ یہ دعوت نظارہ کیا ہوتا ہے جی!

میں ہنسا۔ کہنے لگا۔ کچھ نہیں . . میں ذرا ترجمہ کر رہا تھا۔ اب تم کچن میں جا کر برتن صاف کرو۔ صبح مجھے دو انڈے نیم برشت۔ اور ایک گلاس دودھ کا چاہیئے۔ دوپہر کو کھانا جس میں ٹماٹر اور کدو اور شلغم کبھی شامل نہ ہوں۔ سہ پہر کی چائے میں دفتر ہی میں پیوں گا۔ شام کے کھانے میں چاول ضرور ہونے چاہئیں سوتے وقت میرے گنجے سر میں روغنِ بادام کی مالش تمہیں کرنا ہوگی۔ اس کے بعد تم اپنے کمرے میں سو سکتی ہو۔ ہاں اندر سے زنجیر ضرور لگا لینا۔ ورنہ میں ذمّے دار نہیں ہوں۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ چھوٹی سی لڑکی تو وہ تھی۔ وہ عورت کہاں تھی۔ ابھی تک نوجوانی کے سن میں بڑی مشکل سے آئی ہوگی لیکن اس کا جسم نہیں اس کی آنکھیں کہے دیتی تھیں کہ اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ جہنم کے وہ شعلے

جن کے متعلق ہمارے ہندوستانی شاعر کبھی شاعری نہیں کرتے۔ سماج کے وہ گھناؤنے مناظر حسن کا حسن ہمارے افسانہ نگار کبھی بے نقاب نہیں کرتے۔ خرید و فروخت کے وہ ادارے جن کا ذکر ہمارے چیمبر آف کامرس میں کبھی نہیں ہوتا لیکن جو ہمارے پاک دور ہمارے ہندوستان کی ہر گلی میں ہر گاؤں میں پائے جاتے ہیں اس لڑکی نے اپنے جسم اور اپنی روح کے ہر سانس میں گھستے ہوئے، اسے آجاڑتے ہوئے، تباہ و برباد کرتے ہوئے، اُسے نوچ نوچ کر چیرتے پھاڑتے ہوئے ایک بھوکے وحشی بھیڑیے کی طرح بھنبھوڑتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں ابھی تک زخمی تھیں۔ اس کا نچلا لب اندر کو بھنچا ہوا تھا۔ کسی اذیت ناک کرب کی وجہ سے، اور اس کا نچلا ہونٹ ذرا آگے کو جھکا ہوا تھا۔ اور کسی مرد کو اپنے قریب آتے دیکھ کر تھرانے لگتا تھا۔ اور سینے کے خم کانپنے لگتے تھے۔

میں نے اُسے ہنسانے کی کوشش کی۔

"میاؤں"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ کچن میں دال بگھار رہی تھی۔ پوچھنے لگی

"کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ میں بلّی ہوں۔ تم چوہا..... بلکہ چوہیا ہی ہی ہی!!!

وہ خاموش رہی میں سرسدہ ہوگیا۔ اور اپنا گنجا سر کھجانے لگا۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔

ایک دن کہنے لگی "میں دھوپ میں تمہارا کھانا لے کر آتی ہوں۔ میرے پاؤں جلتے ہیں۔

میں نے اس کے گندے۔ گرد و غبار میں اٹے ہوئے پاؤں پر نظر ڈال کر کہا۔ "ارے رے .. تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا" میں نے بازار سے اسے ایک جوتی خرید کر دی۔ اور سفید دھوتیاں جن کے کنارے رنگین تھے۔ اپنے گنجے سر کو چھپانے کے لئے ایک سمور کی ٹوپی لایا۔ ایک سینٹ کی شیشی۔ کریم اور اس کے لئے ہیر کلپ۔

جب بھی وہ نہ مسکرائی

پورے ایک ماہ کے بعد میں نے اسے پندرہ روپے دیئے۔ لو! یہ تمہارے ہیں انہیں تم جس طرح چاہو خرچ کر سکتی ہو۔

اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اور پھر آنکھیں جھکا کر روپے لے لئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور بھی زیادہ اداس ہوگئی ہے۔

چاندا! میں نے کہا۔ کیا بات ہے؟

جی کچھ نہیں۔

رات کو جب وہ میرے سر میں روغنِ بادام کی مالش کر رہی تھی، وہ کہنے لگی۔
کیا آج رات کو مجھے یہاں سونا ہوگا؟

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کیوں۔ کیوں؟۔ ۔کیا بات ہے؟ .... میں نے تم سے؟۔ ۔ ۔

وہ کہنے لگی۔ آج صبح آپ نے مجھے پندرہ روپے جو دیئے تھے۔

میں کانپنے لگا۔

وہ بولی۔ پھوپھا مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستر پر سو جانے کے لئے مجبور کرتے تھے۔ اور پھر مجھ سے سب روپے بھی چھین لیا کرتے تھے۔ آپ بھی اگر مجھ سے روپے چھیننا چاہتے ہیں۔ تو ابھی واپس لے لو۔

میں نے کہا۔ نہیں یہ شبہ کیسے ہوا ہے؟

وہ بولی۔ تو آپ یہ روپے مجھ سے واپس نہ لیں گے؟

نہیں!

اور۔ اور مجھے۔ ۔ (اشارہ کرکے) یہاں بھی نہ سلائیں گے؟

نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تم کیوں اس طرح ... ؟

وہ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی آنکھیں حیراں تھیں۔

ایک دن وہ کچن میں بیٹھی شیشہ سامنے رکھے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اور ایک گیت گا رہی تھی۔ کچھ عجیب سا گیت تھا۔ فحش بازاری۔ لیکن اس میں بھی عورت نے مرد کے خلاف اور سماج کے خلاف جو مرد کا سماج ہے اپنے غم کو بیان کیا تھا اک عجیب سا گیت تھا جس کے الفاظ اجازت نہیں دیتے کہ انہیں یوں ادب کی زبان میں بیان کیا جائے۔ اس گیت کا ترجمہ بہت ہی مشکل ہے۔ یہ گیت تھا۔ ایک بازاری عورت کی گالی بھی تھی۔ جو اس نے جل کر مردوں کے خلاف بکی تھی۔ اور چاند اسے آہستہ آہستہ سے نفرت کے احساس سے متاثر ہو کر گا رہی تھی۔ یہ گیت جو رات کے اندھیرے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ گیت جو قحبہ خانے کی غلام فضا میں اجاگر ہوا تھا۔ یہ گیت جو صدیوں کے ظلم و ستم، جبر و استبداد کے خلاف عورت کی مسکی کچلی، زخمی روح کا احتجاج تھا۔ ایک موٹی، مسلسل سی گالی، لیکن احتجاج کی روح تو پاک و صاف تھی۔ اس کا غم اور غصہ تو شعلے کی طرح کندن تھا۔ گیت اچھا تھا۔ لیکن ماحول نے اسے ایک غلیظ سا لباس عطا کیا تھا۔ اس مفلس و نادار دوشیزہ کی طرح جو اپنی معصومیت کو گندے چیتھڑوں میں چھپائے ہو۔

چاند کیا گا رہی ہو۔ میں نے شرارت سے پوچھا۔

وہ چپ ہو گئی۔

چاند!

وہ بولی جی۔ کچھ نہیں۔

چہرے پر مسکراہٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ اوپر کا لب اندر کو بھنچا ہوا تھا۔ اور نچلا لب ذرا آگے جھک کر کانپ رہا تھا۔ اور دانتوں کی لڑی بیچ میں جھلک رہی تھی۔ مجھے اُس وقت وہ اُس بے بس ہرنی کی طرح نظر آئی۔ جو چاروں طرف سے نا اُمید ہو کر ایک کونے میں آکر کھڑی ہو گئی ہو۔ آخری مدافعت کے لئے۔

میں نے کہا۔ تمہیں معلوم ہے "وہ" تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آج کل وہ تمہارے لئے بہت سٹہ کھیلتا ہے۔ شاید اس کی قسمت پھر جائے اور وہ تمہارے لئے ایک گھر لے سکے۔

وہ کہنے لگی۔ پھوپھا کے ہاں ہر مرد یہی کہا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔

اور اس نے آئینہ الٹا کر دیا۔ اور کنگھی بھی زمین پر رکھدی۔

(۴)

اُس روز قیمے کے پراٹھے اور مرچوں کا اچار اور مکھن دستر خوان پر تھا

اور ہم لوگ کھا رہے تھے۔ میں اور چاند اور وہ۔ چاند کی صحت اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اور گالوں پر ہلکی سی سُرخی آگئی تھی۔ جیسے پکتے ہوئے آٹے کی جلد ملائم پڑگئی تھی۔ جسم گدرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں کی حزیں چمک بھی اس قدر اداس نہ تھی۔ پھر بھی لبوں پر مسکراہٹ نہ آئی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے یہ لڑکی اب کبھی مسکرا نہیں سکتی۔ جیسے یہ لڑکی اب کبھی عورت نہیں بن سکتی۔ جیسے یہ چاند ہمیشہ کے لئے گہنا گیا ہے جیسے اس روح کو کبھی قرار سکون، اعتماد اور محبت عطا نہیں ہو سکتی۔ جیسے یہ زندگی کبھی خوشی، مسرت اور بہجت سے معمور نہیں ہو سکتی۔ جیسے یہ حیات اُس مرمریں ٹھلیا کی طرح ہے جس میں لوگوں نے جا بجا سوراخ کر دیئے ہوں۔ اُدھر پانی ڈالو۔ اِدھر غائب اس خالی گیت کو جو ایک تلخ گالی تھی اب کوئی خوشی سے معمور نہیں کر سکتا۔ وہ دسترخوان پر بیٹھی تھی۔ پہلی مرتبہ بس نے اسے اپنے ساتھ دسترخوان پر شریک کیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی موجود تھا۔ لیکن اُسے اس کی خوشی نہ تھی۔ لیکن چاند کو اس عزّت افزائی کا مطلق کوئی احساس نہ تھا۔ ہمارے ساتھ بیٹھنے کی خوسی نہ تھی۔ قیمے کے پراٹھے اور مکھن کی ڈلی اُسے مرعوب نہ کر سکی۔ رنگیں کنارے والی دھوتی اور اونچی ایڑی کا سینڈل پہننے کی خوشی نہ تھی، وہ چپ چاپ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی اور ہم لوگ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے کام لے کر اُسے

ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ بالکل ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔ خاموش، اداس پژمردہ۔ اور یکایک مجھے احساس ہوا کہ سماج کے عفریت کا گناہ، عصمت دری سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس کی عصمت کے چھن جانے کا مجھے اتنا افسوس نہ تھا۔ ہر عورت کی عصمت ایک دن چھن جاتی ہے۔ اپنے خاوند کے ہاتھوں یا کسی غیر مرد کے ہاتھوں افسوس تو یہ تھا کہ سماج نے اس چودہ برس کی لڑکی کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔ اس کا اعتماد چھین لیا تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ۔ کہ اس کی ہنسی چھین لی تھی اور جب کسی انسان سے اس کی ہنسی چھین لی جائے تو اس سے بڑھ کر بدقسمت فرد اور کوئی نہیں ہو سکتا!

کھانا کھا کر اسے گہری نیند آ گئی۔ کہ جب آنکھ کھلی تو چھ بجے تھے۔ سورج ابھی غروب نہ ہوا تھا۔ لیکن دھوپ بالکل ماند پڑ گئی تھی۔ اور سائے گہرے ہو گئے تھے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چل رہا تھا۔ میں آہستہ سے اٹھا۔ کیونکہ سٹے باروں کا دلال ابھی تک غالیچے پر چت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ سونے دو کم بخت کو۔ اسے کیا معلوم۔ بہار کیسے کہتے ہیں۔ کھڑکی کھول کر دیکھا تو شمال سے بادلوں کے پرے کے پرے صف باندھ کر چلے آ رہے تھے۔ میں نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ آہا۔ آج بارش ہو گی۔ جب گنجے سر پہ بارش کی پہلی بوندیں پڑتی ہیں۔ تو روح کو وہ بالیدگی حاصل ہوتی ہے

جو قیمے کے پراٹھے کھانے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر یقین نہ آئے تو سر منڈا کر دیکھئے۔ اولوں سے بچئے۔ لیکن بارش کی بوندوں کو اپنے سر پر برس جانے دیجئے۔ تراوٹ حاصل ہوتی ہے۔ انتی خوشی ہوتی ہے۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور غسلخانے کی طرف جانے لگا۔ غسلخانے کے باہر پتھر کے چبوترے پر حانو بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں طشتری تھی اور طشتری میں آم کی کیری کے قتلے اور سرخ مرچ اور نمک اور نیبو کے رس میں پڑے ہوئے قتلے۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک چور کی طرح جھپی۔

میں نے کہا۔ مزیدار ہیں۔

بلے حد۔ کھاؤگے؟

میں نے سر ہلایا۔

اس نے ایک قتلہ مجھے دیا۔ وہ میرے بالکل قریب آگئی۔ آہستہ سے کہنے لگی۔ میں نے پتھر مار کر اس پیڑ پر سے ان امبیوں کو توڑا ہے۔ بیحد مزیدار ہیں نا۔

ہوں ——— ہوں میں نے کھاتے ہوئے کہا۔ کیسے چٹپٹے مزیدار ہیں!

یکایک وہ مسکرائی اور یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے بڑھ کر اس کے سارے چہرے پر، سارے جسم پر، ساری فضا پر پھیلتی گئی۔

اس کا اوپر کا ہونٹ جو اندر کھنچا ہوا تھا۔ آہستہ سے نرم پڑتا گیا۔ اور اپنی اصلی حالت پر آتا گیا۔ اس کا غم پرانا تھا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ پرانی نہ تھی۔ نئی تھی۔ نوجوان تھی۔ خوبصورت تھی معصوم اور غیر ملوث تھی۔ اُس حیا پرور کلی کی طرح جو کھلنا چاہتی ہو۔ اور پھر شرما کر پردوں کی اوٹ میں چھپ جانا چاہتی ہو۔ لیکن اب۔ یہ مسکراہٹ کھلتی گئی۔ گیت نے اپنا غلیظ لباس اتار پھینکا۔ اور اس کے جسم میں خوشی کا نغمہ پیرنے لگا۔ ہم دونوں ہنسنے لگے۔ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

مں نے کہا۔ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ ایک پتھر اور مارو۔ اور ابابیل تو بڑی مزیدار ہیں۔

اس نے پتھر ہاتھ میں اٹھایا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

(۴)

بہ تم نے کیا کیا۔ اُسے اپنے گھر بھیج دیا؟

میں نے کہا۔ میں نے اپنی ماں جی کو لکھ دیا ہے۔ کہ چاند میرے ایک عزیز دوست کی منگیتر ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ وہ چاند کی دلجوئی کریں گی۔

لیکن وہ وہاں خوش رہ سکے گی۔

میں نے کہا۔ میرے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ وہاں اس سے کوئی

کوئی عشق کرنے والا نہیں۔ چاند کو اب عشق کی ضرورت نہیں۔ اسے رنگین دھوتیاں اور سینڈلوں کی بھی ضرورت نہیں۔ خوشی قیمے کے پراٹھوں میں بھی نہیں اور دسترخوان پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانے میں بھی نہیں۔ اور اس سے ازراہِ ترحم شادی کرنے میں بھی نہیں۔ ان چیزوں سے اس کی مسکراہٹ اس کی خوشی لوٹ کر نہیں آسکتی۔

تم کیا کہہ رہے ہو۔

میں نے اس کی بات ان سنی کرکے کہا۔ میں گنجا ہوں اور تم اندھے فلسفی ہو۔ اور دنیا ناپاک چھوچھاؤں سے بھری ہے۔ ذرا اسے میری ماں کی ممتا اور شفقت کی چھاؤں میں دم لینے دو۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے معصوم قہقہوں سے اپنے زخموں پر مرہم لگانے دو۔ اُسے ہنسنے دو۔ اور اُسے بھول جانے دو۔ اُسے ہنسنے دو۔ اور اُسے بھول جانے دو..... !!!

یکایک وہ سمجھ گیا۔ اور دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر میری گنجی چاند پر چٹکی لے کر بولا۔

تم کورے جذباتی ہو۔ میرا شبہ درست نکلا۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری عقلیت کے پس پردہ خطرناک جذباتیت ہے۔ میرا شبہ درست نکلا..... کون تھی وہ جس نے تمہیں یہ کربناک ثنویت عطا کی، جس نے تمہاری آنکھوں کا نور چھین لیا۔ جس

نے تمہارے گھنے بالوں کے جنگل اجاڑ دیئے۔ جس نے تمہاری مسکراہٹ میں یاس و قنوط کی تلخی جھلکا دی۔ کون تھی وہ ؟

میں نے کہا۔ زندگی ایک جوا ہے۔ یہ بتاؤ آج سٹے میں کیا لگے ؟ نو سے دو یا پانچ سے سات ؟

(ایک تمثیل)

افراد

(۱) جگ موہن۔ نوجوان رئیس زادہ جوشیلا۔ باتونی۔ بے عمل۔ ڈرپوک۔
خطیبانہ اندازِ گفتگو۔

(۲) رمبھا ۔ جگ موہن کی بیوی۔ کم گو۔ ہنسی اور لہجے میں طنز کی جھلک نمایاں ہے

(۳) ونود۔ .. جگ موہن کا دوست

(۴) انور۔ ... جگ موہن کا دوست۔ آواز بھاری ہے۔

(۵) منشی جی. کارندہ۔ وکیل۔ نیم۔ خوشامدی۔ تملق پسند۔

(۶) پاسی... .. نئے زمانے کا کسان۔

(۷) سیٹھ جی .. پرانے زمانے کا رئیس۔ بھاری تحکمانہ لہجہ۔

(۸) چھمیا۔ سیٹھ جی کی نوجوان اور شوخ داشتہ

وقت۔ سہ پہر۔

مقام۔ جگ موہن کا ڈرائنگ روم۔ ایک دروازہ سیٹھ صاحب کے دیوانخانے میں کھلتا ہے۔ دوسرا رمبھا کے مطالعہ کے کمرے میں۔ تیسرا دروازہ ملاقاتیوں کے لئے ہے۔ اس وقت تینوں دروازے کھلے ہیں۔

(جب پردہ اٹھتا ہے تو)

جگ موہن۔ رمبھا۔ انور اور ونود چائے پی رہے ہیں۔

جگ موہن۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا انور؟

انور۔ جگ موہن بھائی، میں تم سے کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ مجھے تمہاری باتیں یاد نہیں رہتیں۔ پھر میں تمہاری ڈائری نہیں۔ یادداشت نہیں۔ روزنامچہ نہیں اور اس پر مصیبت یہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ جو جملہ تمہاری زبان سے ادا ہوتا ہے وہ ارسطو کی آخری تصنیف ہے۔

رمبھا۔ (ہنستی ہے)

جگ موہن۔ رمبھا اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔

رمبھا۔ کچھ نہیں (کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے)

جگ موہن۔ پھر وہی، ٹھی ٹھی ہنس رہی ہو۔ آخر مجھے بھی کچھ پتہ چلے۔

رمبھا۔ انور بھائی کو ان کے والد مجبور کر رہے ہیں کہ وہ ان کے اینٹوں کے بھٹے کا کام سبھالیں۔ اور انجمنِ فلاح و بہبودیٔ خواتین ہند کا کام ترک کر دیں۔ اس پر انور بھائی کو غصہ آ رہا ہے۔ اور وہ غصہ اب آپ پر اُتارا جا رہا ہے۔ کیوں انور بھائی ؟

انور۔ تمہیں چڑیل زبیدہ نے بتایا ہوگا۔

ونود۔ یہ بھی اچھی رہی (ہنستا ہے)

انور۔ تم چپ رہو۔ ونود۔

جگ موہن۔ ونود کیوں چپ رہے۔ اس ٹریجڈی کے متعلق تمہارے ہر دوست کو کہنے کا حق ہے۔ لیکن مجھے اس میں ہنسی کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر تمہارے والد صاحب کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ تمہیں اینٹوں کے بھٹے کے کاروبار میں لگا دیں۔ تم سوسائٹی کے ایک تعلیم یافتہ فرد ہو۔ روشن خیال بلکہ آزاد خیال ہو، تم اپنی زندگی قوم و ملت کے لئے وقف کر دینا چاہتے ہو۔ ہندوستان کی اُن لاکھوں کروڑوں معصوم و بے زبان عورتوں

کے لئے۔

رمبھا۔ انجمنِ فلاح وبہبودئی خواتینِ ہند (ہنستی ہے)

جگ موہن۔ پھر؟

رمبھا۔ معاف کیجئے جگ ڈارلنگ۔ مجھے اینٹوں کا بھٹہ یاد آرہا ہے (ہنسی ہے)

جگ موہن۔ اینٹوں کا بھٹہ؟ ہاں ہاں۔ اینٹوں کا بھٹہ انور کی ذہانت کو کچل کر رکھ دیگا۔ اس کی فطری صلاحیتوں کو پامال کر دیگا۔ دنیا کے کسی باپ کو یہہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس طرح اپنے بیٹے کی روحانی تمناؤں کو کچل دے، یہ سماج کا ظلم ہے۔ بیداد ہے! بیداد ہے!! بیداد ہے!!!

ونود۔ تمہیں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا چاہیئے انّو۔

انور۔ تم چپ رہو ونود۔

جگ موہن۔ ونود کیوں چپ رہے۔ ونود بھی تمہارا دوست ہے۔ وہ بھی ایک روشن خیال بلکہ آزاد خیال فرد ہے۔ وہ بھی ایک نئے سماج کی تعمیر چاہتا ہے۔ جس میں باپ بیٹے پر ظلم نہ کر سکے۔ جس میں ماں باپ اپنے بیٹے کی مرضی کے خلاف اس کی امیدوں کے ہرے بھرے نخلستان کو برباد نہ کر سکیں۔ میں کہتا ہوں۔ انّو تم انکار کر دو۔ فوراً انکار کر دو۔ کہدو میرا اینٹوں

کا بھتہ نہیں چاہتا۔

رمبھا۔ (ہنس کر) انجمنِ فلاح و بہبودیٔ خواتینِ ہند چاہتا ہوں۔

جگ موہن۔ رمبھا!

رمبھا۔ sory

جگ موہن۔ انکار کر دو انور۔ ورنہ تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ نیا اخلاق اس ظلم کو چپ چاپ سہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ زندگی ایک مقدس شے ہے۔ اور جو والد اپنے بیٹے کی زندگی تباہ کرنا چاہے۔ دانستہ یا نادانستہ۔ شعوری یا لاشعوری طریق پر۔ وہ خود بداخلاق ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں، اگر میرا باپ مجھ سے اس قسم کی بداخلاقی برتتے تو۔

(چھمیا گاتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے)

چھمیا۔ نجریا توری ـــــ سانوریا! نجریا توری ـــــ اوہ چھوٹی سرکار ہیں! معاف کیجیے گا میں سمجھی بڑی سرکار......

جگ موہن۔ سیٹھ صاحب دیوانخانے میں ہیں۔ اسی دروازے سے چلی جائیے۔

چھمیا۔ اوہ شکریہ، شکریہ (سار نگئے سے) چلے آؤ دونو (گاتی ہوئی) سانوریا! نجریا توری ـــــ سانوریا!

جگ موہن۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ونود۔

ونود۔ ذکر باپ کی بداخلاقی کا ہو رہا تھا کہ۔

رمبھا۔ کہ چھمیا جان آگئیں (ہنستی ہے)

جگ موہن۔ رمبھا تم یونہی ہمیشہ بے موقع ہنستی ہو۔

رمبھا۔ معاف کردو جگ ڈارلنگ، میں تم پر نہیں۔ چھمیا جان کے لباس پر ہنسی تھی کیسا بھونڈا مذاق ہے اس کا۔ شانے ننگے۔ سینہ ننگا۔ بلاوز پیچھے سے کھرا کھلا ہوا عریانیت کی زندہ تصویر۔

جگ موہن۔ میں عریانیت کو بُرا نہیں سمجھتا۔ تمام جانوروں میں سے صرف انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو کپڑے پہنتا ہے۔ یہ امر خلافِ فطرت ہے۔ میں تو زندگی کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔

ونود۔ یعنی ننگا۔ عریاں۔

جگ موہن۔ ہاں عریاں۔ عریانیت ہی زندگی کا صحیح اخلاق ہوگا۔ جب ہم اپنی زندگی اپنے قول و فعل، اپنے سماج، اپنی معاشیات، اپنے رسم و رواج کو بالکل ننگا دیکھ سکیں گے۔ اس وقت و سیاصحیح معنوں میں آزاد ہو گی۔ جب ظاہر و باطن میں فرق نہ ہوگا جب کہنے اور کرنے میں فرق نہ ہوگا۔ جب انساں کی معاشی

وتمدّنی زندگی پر پڑے ہوئے سب نقاب، کپڑے اور چھلکے اُتر جائیں گے۔
جب دنیا آزاد ہو گی۔ جب جا کر کہیں دنیا میں امن قائم ہو گا۔ عریانیت ہی
نظامِ زندگی ہے۔ جو ہمیں ترقی کی طرف لے جا سکتا ہے۔

انور۔ کیا ترقی ننگے سینے، ننگے شانے اور گہرے کٹے ہوئے بلاؤز سے تعلق رکھتی ہے۔

جگ موہن۔ میں تو چھمیا کو داد دیتا ہوں۔ کہ وہ کم سے کم کپڑا استعمال کرتی ہے۔ آخر
انسانی جسم کی ساخت تو وہی ہے۔ اس سے سب دنیا واقف ہے۔ اُسے
چھپانے سے کیا حاصل۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا۔ کہ انسانی جسم کی ساخت سے
کس طرح بداخلاقی پھیلتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ کہ فطرت بداخلاق ہے۔ ورنہ
ننگے سینے، ننگے شانے دیکھ کر آپ کے دل میں بداخلاقی عود نہ کر آتی۔

ونود۔ فطرت بداخلاق نہیں ہے۔

رمبھا۔ فطرت بداخلاق ہے۔ ونود بھائی۔ ورنہ آپ حضرت گنج میں کپڑے کی دُکان
نہ کرتے۔

ونود۔ میں ـــــ میں ـــــ کپڑوں کی دکان کرتا ہوں۔ مگر اس کا عریانیت سے
کیا تعلق۔ بداخلاقی سے کیا واسطہ۔ وہ تو میرے والد کی دوکان ہے۔

انور۔ تو انیٹوں کا بھٹہ بھی تو میرے باوا کا ہے۔

رمبھا۔ (ہنس کر) اور چھمّا جان بھی تو جگ موہن کی ہیں۔ بڑے سیٹھ صاحب کی داشتہ ہے۔ (پس منظر میں چھمبا کے گانے کی آواز آتی ہے)

جگ موہن۔ رمبھا!

رمبھا۔ معاف کر دو جگ ڈارلنگ۔ مگر میں تو تمہارے حق میں بات کر رہی تھی ۔۔۔

آہ، یہ غزل تم نے سُنی۔ چھمیا کبھی کبھی تو دل تڑپا دیتی ہے! ذرا یہ دروازہ تو کھول دو چپکے سے۔

(اب چھمبا کے گانے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے)

چھمیا۔

نہ شعور میں جوانی، نہ خیال میں روانی — کوئی سن کے کیا کریگا مری دُکھ بھری کہانی

تری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ — وہ خرد کی تنگ ظرفی یہ جنوں کی بیکرانی

رہے دل کا داغ دائم کہ جھلک رہی ہو اس میں — مرے مہر کی تمنا، ترے قہر کی نشانی

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں اُدھوری

مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی

سیٹھ جی۔ دروازہ بند کر دو۔ جگ موہن! دروازہ بند کر دو!

انور۔ دروازہ بند کر دو

ونود۔ دروازہ بند کردو کہ چھمیا گا رہی ہے۔

رمبھا۔ چھمیا جو عریانیت پسند ہے۔

انور۔ چھمیا جو طوائف ہے۔

جگ موہن۔ مجھے طوائفیت پسند نہیں۔ مگر سیٹھ جی کی پرائیویٹ زندگی ہے میں انہیں کیسے سمجھاؤں اور میں یہ حق بھی نہیں رکھتا کہ اُن کی پرائیویٹ زندگی میں دخل دوں۔ میں کسی انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسان کی پرائیویٹ زندگی میں دخل دے۔ یہی سچی آزادی ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ انور کو وہ اینٹوں کا بھٹہ . . . .

ونود۔ پھر وہی اینٹوں کا بھٹہ۔

انور۔ ارے بھئی۔ ایک بار کہہ دیا میں نے تمہاری باتیں سُن لیں۔ بڑے جھگڑے جھگڑے ہیں میں اتبا سے ضرور لڑوں گا۔ اور اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے نہیں جاؤں گا مگر مجھے تمہارا فلسفۂ زندگی اتنا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ اتنا سچا بھی معلوم نہیں ہوتا کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہارے والد کی پرائیویٹ زندگی تمہاری پرائیویٹ زندگی پر اثر انداز نہیں ہوئی۔

جگ موہن۔ بالکل نہیں۔ تم جانتے ہو مجھے طوائفیت سے پرانے ساختی نظام سے کوئی

تعلق نہیں۔ میں توطوائفیت کو مٹاکر عورت اور مرد دونوں کو برابر کا درجہ دینا چاہتا ہوں۔ میں تو ایک ایسا سماج چاہتا ہوں۔ جہاں کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب سب برابر ہوں۔ مساوات مکمل مساوات کا حامی ہوں انور بھائی۔ تم میرے قول اور فعل میں کبھی کوئی تضاد نہ پاؤ گے۔ یہ فلسفۂ زندگی میری حیات کا جزوِ عظیم ہے۔

رمبھا۔ ہیر! ہیر!!

جگ موہن۔ رمبھا تم یہاں سے چلی جاؤ

رمبھا۔ (Darling Sorry) مگر میں تو نہیں ستا ما تی دے۔ ہی ہی

جگ موہن۔ ہاں تو وہ سب ٹھیک ہے۔ مگر تم سبھی اب یہاں سے چلے جاؤ۔ دیکھو۔ آج شام کو ہمیں بھی دیکھنا ہے۔ بڑی خوبصورت فلم ہے اور پھر مسز دامنگیر کے ہاں چائے بھی ہے۔ اور اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ رمبھا ڈارلنگ !

رمبھا۔ اچھا تو انور بھائی رخصت، وہ اینٹوں کا بھٹہ کہاں ہے۔

انور۔ دلیپ پور میں۔ یہاں سے بیس کوس پر۔

رمبھا۔ کسی دن میں اور جگ موہن تم سے ملنے آئیں گے وہاں۔

انور۔ مگر سنئے۔ میں تو وہاں نہیں جا رہا.....

رمبھا۔ (زور سے) گڈ بائی۔ (منشی جی آتے ہیں)

انور۔ بھابھی بھی عجیب باتیں کرتی ہیں۔

منشی جی۔ اے حضور۔ یہ باسی کسان آیا ہے دھیپے گاؤں کا مکھیا ہے۔

جگ موہن۔ تو میں کیا کروں۔ اسے سیٹھ صاحب کے پاس لے جاؤ۔

منشی جی۔ حضور۔ وہ سیٹھ صاحب تو اس وقت مل نہیں سکتے۔ آپ جانتے ہیں ہی ہی ہی

جگ موہن۔ اوہ —— ہاں —— اچھا تو یہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

منشی جی۔ غریب پرور۔ یہ گاؤں کا مکھیا ہے۔ اور گاؤں والے اب کے لگان نہیں دینا چاہتے۔ ہی ہی ہی

جگ موہن۔ لگان نہیں دینا چاہتے!

باسی۔ (پوربی لہجہ میں) سرکار۔ اب کے فصل نہیں ہوئی۔ بارش کی ایک بوند نہیں برسی۔ لگان کہاں سے دیں سرکار۔ اس دفعہ ہمیں معافی مل جائے۔ تو اگلی بار سب معاملہ چکا دیں گے حضور۔

جگ موہن۔ لیکن لگان کیسے معاف ہو سکتا ہے۔ کم از کم میں اس معاملے میں کیسے دخل دے سکتا ہوں۔ سیٹھ صاحب جانیں۔

پاسی ۔ سرکار آپ چھوٹے راجہ ہیں۔ آپ کی تعریف ہم نے بہت سنی ہے۔ آپ سب کو
برابر سمجھتے ہیں سرکار۔ سب کا خیال رکھتے ہیں چھوٹے سرکار۔ گاؤں میں آپ کے
دھرم کا بہت چرچا ہے۔ سرکار۔ آپ ظلم کے خلاف ہیں۔ ہم گریب کسانوں
کے مائی باپ ہیں۔

جگ موہن ۔ لیکن لگان کا معاملہ اور ہے بھائی!

منشی جی ۔ یہی تو میں بھی کہتا ہوں حسور۔ یہ پاسی کسان کچھ سمجھتا ہی نہیں ۔ کہ ہر کس
بقدرِ ہمت اوست ۔

جگ موہن ۔ کیا کہا؟

منشی جی ۔ جی ۔ کچھ نہیں ۔ فارسی کا ایک محاورہ تھا۔

جگ موہن ۔ آپ بھی بڑے

منشی جی ۔ (آہ بھر کر) جی ہاں ۔ سرکار ۔ وہ زمانہ بدل گیا۔

پاسی ۔ تو لگان معاف نہیں ہو سکتا سرکار۔

منشی جی ۔ تمہارا لگان معاف کر دیں تو ہمارا کام کیسے چلے پاسی! رہستا ہے،

پاسی ۔ تم چپ رہو جی ۔ میں اپنے سرکار سے پوچھ رہا ہوں ۔ سرکار؟

جگ موہن ۔ نہیں پاسی ۔ زندگی کی ایک چولی بدل دینے سے ساری زندگی نہیں

بدل جاتی۔ تمہیں لگان دینا ہوگا۔ ہمیں لگان لینا ہوگا۔ اس وقت تک جب تک کہ زمانہ نہ بدل جائے۔ انسانیت نہ بدل جائے۔ اخلاق نہ بدل جائے۔

پاسی۔ مگر زمانہ کون بدلے گا میٹھ صاحب۔ سرکار آپ ہی بدلیں تو بدلیں۔ بڑی امید لے کر آئے تھے ہم۔

جگ موہن۔ ہم اکیلے لگان معاف بھی کر دیں تو اس سے کچھ نہ ہوگا۔ اس سے تاریخ کا بہاؤ نہ بدلے گا۔

پاسی۔ تاریخ کا بہاؤ! سرکار کیا کہہ رہے ہیں؟ گندم کا بھاؤ سُنا تھا۔ جوار باجرے مکئی کا بھاؤ سنا تھا۔ یہ تاریخ کا بھاؤ کیا بلا ہے؟

منشی جی۔ چلو پاسی کسان۔ تکرار فضول ہے ہم دونوں تاریخ کا بہاؤ کیا جانیں

ہی ہی ہی!!!

بڑی اُمید لے کر آئے تھے۔ رام رام سرکار۔ ذرا غور سے دیکھیے گا۔ سرکار۔

دو چار دن میں تاریخ کا بھاؤ اوپر نیچے نہ ہو جائے۔ (انور اور دونوں ہنس رہے ہیں)

جگ موہن۔ تم ہنس رہے ہو۔ میرا دل رو رہا ہے

انور۔ جگ موہن۔ اب میں چلتا ہوں۔

جگ موہن۔ کہاں؟

انور۔ وہیں اینٹوں کے بھٹے پر۔

جگ موہن۔ تم نے فیصلہ کر لیا۔

انور۔ ہاں (ہاتھ ملاتے ہوئے) رخصت!

ونود۔ اور میں بھی چلتا ہوں۔

جگ موہن۔ تم بھئی کہاں؟

ونود۔ کپڑوں کی دوکان پر، عریانیت ڈھاپنے کے لئے (ہنستا ہے) رخصت۔

(چلے جاتے ہیں۔ رمبھا آتی ہے)

رمبھا۔ چلے گئے؟

جگ موہن۔ ہاں، چلے گئے اپنے آدرش کو چھوڑ کر غلیظ، پرانی، سڑی، گندی زندگی کے ڈربے میں واپس چلے گئے۔

رمبھا۔ (آہستہ سے) یہاں سب گندے ہیں۔ یہاں سب غلیظ ہیں۔

جگ موہن۔ کیا کہا — ایں۔ یہ تم نے کیسا بلاوز پہن رکھا ہے۔

رمبھا۔ خوبصورت ہے نا؟

جگ موہن۔ خوبصورت؟ شانے تنگے ہیں۔ گھیرا کٹا ہوا ہے۔ اور سینہ بھی . . .

رمبھا۔ تم تو زندگی کو اُس کے اصلی روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہو۔

جگ موہن۔ مگر یہ تو عریانی ہے۔

رمبھا۔ تم تو عریانی پسند کرتے ہو۔

جگ موہن۔ پسند کرتا ہوں۔ دوسری عورت میں۔ اپنی بیوی میں نہیں!

رمبھا۔ تو یہ بلاوز اتار دوں۔ (سیٹھ جی آتے ہیں)

سیٹھ جی۔ جگ موہن! جگ موہن! بیٹا۔ کہاں چلے۔

جگ موہن۔ جی، پتاجی۔ وہ لیڈی وامنگیر کے ہاں چائے . . . . !

سیٹھ جی۔ ارے ہاں۔ وہاں ضرور جاؤ۔ اور سنو۔ سر وامنگیر سے اینٹوں کے ٹھیکے کے
بارے میں بھی ذکر کرنا۔ سنا ہے وہ ٹھیکہ تمہارے دوست انور کے والد کو ملنے
والا ہے۔ لیکن اگر تم کوشش کرو۔ تو۔

جگ موہن۔ بہت اچھا۔

سیٹھ جی۔ اے . . . اے . . . کہاں جارہی ہو، بیٹی۔

رمبھا۔ جی ابھی آئی!

سیٹھ جی۔ رمبھا آج وہی بلاوز پہنے تھی جو چھپیا نے پہنا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ دونوں کا درزی
ایک ہے (ہنستا ہے) آجکل کی شریف زادیاں طوائف دکھائی دیتی ہیں۔ اور طوائف
شریف زادیاں (ہنستا ہے)

جگ موہن۔ (غصّے سے) رمبھا۔ بلاوز تبدیل کرنے گئی ہے۔ پتا جی۔

سیٹھ جی۔ ارے بھئی۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ دیکھو۔ زیادہ دخل نہ دیا کرو۔ عورتوں کی باتوں میں۔ رمبھا جس طرح کا لباس چاہے پہن سکتی ہے۔ وہ اپنے لباس کو تم سے زیادہ سمجھتی ہے ..... کیا بات ہے منشی جی!

منشی جی۔ جی۔ وہ دھیپے گاؤں کا مکھیا آیا تھا۔ لگان معاف کرانے کے لئے۔ کہتا تھا بارش کی وجہ سے فصل نہیں ہوئی۔

جگ موہن۔ میں نے انکار کر دیا۔ پتا جی۔

سیٹھ جی۔ آدھا لگان معاف کر دیتے! بیٹا! کبھی سختی۔ کبھی نرمی۔ یہی ریاست کا قاعدہ ہے بیٹا۔ موقع محل دیکھ کر کام کرنا چاہیے بیٹا ـــــ لو وہ رمبھا بلاوز تبدیل بھی کر آئی۔

منشی جی۔ جی۔ چھوٹی سرکار تو بس ـــــ

سیٹھ جی۔ ہاں ہاں جانتا ہوں۔ جگ موہن بڑا اولڈ فیشن ہے۔ باتیں بہت بناتا ہے۔ مگر ہے آخر اپنے باپ کا بیٹا! (پیٹھ ٹھپکتا ہے) اور ہنستا ہے۔

رمبھا۔ (آہستہ سے) یہاں سب گندے ہیں۔ یہاں سب غلط ہیں۔

جگ موہن۔ کیا کہا۔

رمبھا۔ (ہنستی ہے) کچھ نہیں۔

جگ موہن۔ پتاجی آپ رمبھا کو سمجھا دیجئے۔ یہ یونہی موقع بے موقع ہنستی ہے (غصّے میں آ کر رمبھا کی طرف بڑھتا ہے)

(رمبھا کھلکھلا کر ہنسی ہوئی بھاگ جاتی ہے)

سپنوں کے اشارے

ایک دفعہ میں نے سپنا دیکھا کہ میں ایک چھوٹا سا بچہ ہوں اور گنّا چوستے چوستے پریوں کے ملک میں آنکلا ہوں۔ پریوں کے ملک کو وہ راستہ جاتا ہے، جو گھاس کے خوشوں کے بیچے سے ہو کر گزرتا ہے۔ اور جہاں کھجوروں کے بڑے بڑے قدآور درخت ہیں اور جھاڑیوں کے جنگل، جہاں چیونٹیوں نے بڑے بڑے پہاڑ بنائے ہیں جہاں تیتریاں رنگارنگ پھولوں کے مکانوں میں رہتی ہیں۔ اور پریوں کے لئے شہد تیار کرتی ہیں اس ملک میں کبھی رات نہیں ہوتی کبھی دن نہیں ہوتا دھوپ آسمانوں اور زینوں سے چھن کر آتی ہے اور اسی لئے بے حد صاف اور خوشبودار ہوتی ہے، اور گھاس کے تنکوں پر پانی کی طرح بہتی ہے اور ندیاں بناتی ہوئی پرستان و سیراب کرتی ہے۔ اس

ملک میں کبھی بارش نہیں ہوتی، بادل کبھی نہیں گرجتے۔ بجلی کبھی نہیں چمکتی، برف کبھی نہیں پڑتی۔ سردی، گرمی، برسات کا پرستان میں کچھ پتہ نہیں۔ ہر وقت بہار کا سا عالم چھایا رہتا ہے۔ کہیں سے موتی لڑھکتے ہوئے آجاتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور اس طرح موتیوں کا تانا بندھ جاتا ہے۔ کبھی تو یہ موتی بالکل شفاف ہوتے ہیں اور کبھی مرمر کی طرح سپید اور ان کے آر پار کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کچھ عرصے کے بعد سپید موتی شفاف موتی بن جاتے ہیں۔ اور پھر گھاس کے تنکوں میں جذب ہو جاتے ہیں اور شفاف موتی دیر تک دھوپ کی ندی میں بہتے رہتے ہیں۔ اور پرستان کے بچّے ان سے کھیلتے رہتے ہیں۔ اُن پر سوار ہوتے ہیں۔ اُنہیں کشتی بنا کر ندی میں سیر کرتے ہیں۔ انہیں بڑے بڑے کھمبوں کے نیچے لاکر باندھ دیتے ہیں اور خود آنکھ مچولی کھیلنے لگ جاتے ہیں۔ اور کناروں پر کھڑے ہوئے پھول ان پرستانی بچوں کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ اور شہد بہاتے والی تیتریاں زعفران کی ڈنڈیوں پر جھولتی ہیں۔ اور پرستان کی فضا میں تعطر کی بارش کرتی ہیں۔ اور ہوا ایسی ہوتی ہے جس سے سارا پرستان ہر وقت جھولتا رہتا ہے ایک ہلکے سے نغمے کی طرح، کیونکہ پرستان میں ہوا نہیں ہوتی۔ راگنی ہوتی ہے۔ اور نغمے کی لے ہی میں ہر پری سانس لیتی ہے، عجیب ملک ہے یہ پرستان!

جب میں گیا جو سنے پرستان پہنچا۔ تو اک بچہ سا تھا۔ اس لئے کسی نے مجھ

سے ہار پرس ہ کی۔ میں ہر جگہ گھومتا رہا۔ تماشے دیکھتا رہا۔ موتی کی کشتیوں میں بیٹھ کر ندیاں پار کرتا رہا۔ کسی نے مجھ سے پاسپورٹ طلب نہ کیا۔ نہ محصول حاصل کیا، نہ گناہ ہی مجھ سے چھپنا۔ صرف ایک پریزاد کو دیکھا کہ اداس اداس گھومتا تھا۔ اور ایک پھول کے دروازے سے دوسرے پھول کے دروازے میں جھانکتا تھا۔ اور کھموں اور جھاڑیوں کے جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ بڑا ہی خوبصورت پریزاد تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اور تلووں میں چھالے تھے۔ اور جب وہ سانس لیتا تھا تو اس کے سانس کی لے میں سے آہ نکلتی تھی پرستان کے لوگ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور چپ ہو جاتے اور خاموشی سے اُسے راستہ دے دیتے تھے۔ میں کئی دن اس کے پیچھے پیچھے گھومتا رہا۔ میں نے دیکھا۔ کہ وہ اکثر ان مونموں کی کشتیوں میں آنے جانے والے مسافروں کو دیکھتا۔ نہایت غور سے جیسے کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو پھر جنگلوں میں پھولوں کی جھونپڑیوں اور پتوں کی چھتریوں اور شاخوں کے تناور ستونوں کے پیچھے کسی کو ڈھونڈتا تھا۔ ہر بار اُسے ناامیدی ہوئی، اور وہ گھبرا کر اپنے گھر لیٹ آتا۔ اور سارے بنانے لگتا۔ ایک دن میں نے ایک نیسری سے پوچھا۔ یہ پریزاد کیا ڈھونڈتا ہے۔

تتری مسکرائی۔ کہنے لگی۔ میری شوخ رنگی ساڑھی نہیں پسند آئی

میں نے کہا۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ تم کیا جواب دیتی ہو۔

تیتری نے پھول کے اندر زرد زرد نازک ڈنٹھلوں کا جھولا بنا رکھا تھا۔ وہ اس پر جا بیٹھی اور جھولے کے جھٹکے سے پھولوں کا زرد زرد غبار ساری فضا میں پھیل گیا۔ میں نے غصّے سے کہا "کیوں گرد اڑاتی ہو۔ بڑی بدتمیز ہو بی"

وہ ہنسی۔ کہنے لگی۔ شہد کھاؤ گے

میں نے کہا۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو۔

اونہہ ہوں" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ اور پھول کی پتّی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں حیرانی سے اس سبز دروازے کی طرف تکنے لگا۔ اس پتّی کے باہر شبنم کا ایک بڑا موتی لٹک رہا تھا۔ میں اس کے اندر جو جھانک کر دیکھتا ہوں تو ایک اور ہی دنیا پاتا ہوں۔ زمرّد کے جڑاؤ فرش پر ایک ایسی خوبصورت شہزادی ناچ کر رہی ہے کہ جس کے تبسّم پر سارا پرستان نچھاور ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ناچ رہی تھی اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مجھے حیران دیکھ کر بولی آؤ۔ ناچو گے؟

میں نے کہا۔ جی مجھے ناچنا نہیں آتا۔

اچھا۔ یہ کیا ہے؟ اس نے گنّے کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

یہ گنّا ہے۔ اس کا رس میٹھا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے کماد اور نیشکر بھی

بولتے ہیں۔ اس کا گڑ بنتا ہے۔ کھانڈ اور شکر اور چینی۔ اور چینی آج کل راشن ہو گئی ہے۔

راشن؟

ہاں۔ مقررہ مقداریں ملتی ہے۔

مقررہ مقدار؟

جی۔ جنگ کی وجہ سے؟

جنگ، وہ کیا ہوتی ہے؟

میں نے کہا۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔ مجھے بھی اس کی زیادہ سمجھ نہیں۔ ابا بتایا

کرتے ہیں۔

ابا؟

جی ہاں۔ ہر بچے کے ماں باپ ہوتے ہیں نا!

وہ سب لڑکیاں قہقہہ مار کر ہنسیں۔

شہزادی کہنے لگی۔ تم بہت عجیب باتیں کرتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟

زمیں سے آیا ہوں۔

وہ بولیں ہم بھی تو زمیں پر رہتے ہیں۔ کیا پرستان کے علاوہ یہاں کوئی اور ملک

بھی ہے۔ اس زمین پر؟

اب ہنسنے کی میری باری تھی۔ میں نے کہا۔ آپ کو کچھ پتہ ہی نہیں اس پرستان کے علاوہ اس زمین پر اور بہتیرے ملک ہیں۔ ہندوستان ہے، انگلستان ہے، امریکہ ہے، جرمنی ہے، جاپان ہے، اور یہ ملک آپس میں لڑتے جھگڑتے . . . . .

شہزادی بیچ میں سے بات کاٹ کر بولی۔ یہ گنّا مجھے دو۔

میں نے ہاتھ بڑھایا۔ تو گنّا یکایک شبنم کے موتی سے جا ٹکرایا۔ اور وہ ایک جھٹکے سے لاکھوں ذرّوں میں ٹوٹ گیا۔ ٹوٹتے وقت مجھے شہزادی اور اس کی سہیلیوں کے قہقہوں کی گم ہوتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اور میں اپنی حرکت پر پشیماں وہیں کھڑا رہ گیا!

آگے چلا تو بہت دُور جا کر مجھے ایک تیز رفتار ٹڈا دکھائی دیا۔ جو اپنے کاندھے پر اُسی پر پرزاد کو اٹھائے گاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میں نے پر یزاد سے پوچھا۔ کہاں جا رہے ہو۔

کھمبوں کے جنگلوں میں۔ ہٹو۔ راستہ نہ روکو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے، اور شبنم کے موتی گم ہو جائیں گے۔ گلاب کا جنگل تو میں نے سارا چھان مارا۔ اب کھمبوں کا جنگل دیکھوں گا . . . ہٹو بھی . . .

میں نے کہا۔ بھلے مانس! تم یہ ہر روز کیسے تلاش کرتے ہو۔ اور ہر کام رہتے ہو۔ اس پرستان میں، میں نے صرف تمہیں اُداس دیکھا ہے۔

ٹڈے نے گایا: "عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم"

میں نے کہا۔ تو کیا پریزاد کو کسی سے عشق ہے۔

ٹڈا بولا۔ واہ تمہیں پتہ ہی نہیں۔

میں نے گنا چوستے ہوئے کہا۔ بھئی میں پرستان میں تو وارد ہوں۔ مجھے کیا معلوم آج آیا ہوں۔ کل چلا جاؤں گا۔

پریزاد نے ٹڈے سے کہا۔ دیر ہو رہی ہے اور تمہیں باتیں بنانے کا بہت شوق ہے .....

ٹڈے نے کہا۔ گھبراؤ نہیں۔ آج دن بھر میں تمہارے ساتھ ہوں ہم شہزادی کو ڈھونڈ نکالیں گے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ تو تم شہزادی کو ڈھونڈ رہے ہو۔ ارے بھئی۔ ایک شہزادی تو میں نے ابھی ابھی دیکھی تھی شبنم کے موتی میں زمرد کے فرش پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ ناچ رہی تھی وہ ادھر راستے میں ایک پھول کے دروازے پر . .

پریزاد یہ سنتے ہی ٹڈے کے کاندھے سے اتر کر بھاگا بھاگا اسی سمت گیا۔ جدھر میں نے اشارہ کیا تھا۔ ٹڈے نے پریزاد کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ اور پھر اپنی ٹانگیں دھوپ کی ندی میں ڈال دیں۔ اور مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ آؤ

تمہیں اس بے چارے پریزاد کی کہانی سناؤں!

بہت اچھا! لو یہ گنّا۔

نہیں نہیں۔ میں ذرا زعفران کے ساتھ شہد ملا کر کھاتا ہوں۔ ڈاکٹر نے پرہیز کرنے کو کہا ہے!

اچھا تو وہ کیا کہانی ہے!

بہت لمبی کہانی نہیں۔ ایک چھوٹی سی داستاں ہے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں؟ ۰ ۰ ۰!

میں نے کہا۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ ابّا نے . . .

ٹڈا بولا۔ ہمارے ہاں ابّا اماں نہیں ہوتے۔ خیر، یہ الگ بات ہے۔ ہاں تو سنو۔

مگر۔ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ابّا اماں نہیں ہوتے تو تمہاری پرورش کون کرتا ہے۔ تمہیں پڑھنا لکھنا کون سکھاتا ہے۔ تمہاری شادی بیاہ کون کرتا ہے، اور بازار سے گنّا خرید کر کون دیتا ہے۔ ارے بھئی

ٹڈا بولا۔ ہم زندگی کی طرح خود رو ہیں۔ ہمارے ہر سانس کی لے میں علم رچا ہوا ہے۔ یہی ہمیں سب کچھ بتا دیتا ہے۔ ہمارے ہاں بازار نہیں ہے، کیونکہ کسی کو

چیزیں خریدنے اور رکھنے اور اُن پر قبضہ پانے کا شوق نہیں ہے یہ جنگل۔ یہ دھوپ یہ شبنم کے موتی، یہ پھول کا شہد، یہ زمین کی زرخیزی سارے برستان کے لئے کافی ہے۔ کیا تمہارے ہاں زمین زرخیز نہیں ہے۔

زرخیز تو ہے اور سب کے لئے کافی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر ـــــ میں رک گیا

مگر کیا؟

تم نہیں سمجھو گے؟

ٹڈے نے کہا۔ تم سچ کہتے ہو۔ ہم تم دونوں دو مختلف دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ تم ہماری بات نہیں سمجھ سکتے ہم تمہاری بات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ مگر جو کہانی میں تمہیں اب سنانا چاہتا ہوں۔ وہ دونوں دنیاؤں میں مشترک ہے۔ یہ محبت کی کہانی ہے!

محبت؟ میں نے کہا۔ ہاں اماں مجھے پیار کرتی ہیں۔ میرا منہ چوم لیتی ہیں۔ ابا مجھے اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک پیسہ بھی دیدیتے ہیں۔ یہی محبت ہے نا۔؟

ہاں یہی محبت ہے۔ لیکن محبت ایک اور طرح کی بھی ہوتی ہے

وہ کیسی محبت ہوتی ہے۔

جیسے .. جیسے ...... وہ میری طرف دیکھکر مسکرایا۔

اوہ۔ میں نے کہا۔ تمہارا مطلب عشق سے ہے؟

ٹڈا گھبرا گیا۔ بولا۔ تمہارے ہاں اس محبت کو عشق کہتے ہیں؟ عجیب بات ہے۔ عشق؟ بات اور اصل یہ ہے۔ کہ ہمارے ہاں ایسی محبت نہیں ہوتی جسے عشق کہتے ہیں ہمارے ہاں محبت ہوتی ہے۔ لیکن ڈنگ دینے والی نہیں۔ کسی پر قبضہ پاکر اسے محبوس رکھنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ یہ بیماری صرف اس پریزادکو ہوئی ہے۔ پہلے پہل اسے شہزادی سے صرف محبت تھی۔ شہزادی کو بھی اس پریزاد سے محبت تھی۔ دونوں خوش تھے۔ اور پرستاں کی ہواؤں میں ناچتے پھرتے تھے۔ شہزادی ان سہیلیوں کے ساتھ اور پریزاد اسے پریزادوں کی صحبت میں بھی رہتا تھا۔ اور کسی کو شکایت نہ تھی۔ گلہ نہ تھا .. ٹڈا یکایک رک گیا۔

دو موتی کہیں سے لڑھکتے ہوئے آئے اور ندی کی سطح پر ناچنے لگے۔ ناچتے ناچتے الگ ہو گئے۔ اور پھر الگ ہو کر لڑھکنے لگے پھر اکٹھے ہو کر ناچنے لگے پھر دو اور موتی کہیں سے آئے۔ اب ندی کی سطح پر بہت کا دلفریب رقص تھا۔ اور کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ دو موتی اب کہاں ہیں۔

ٹڈے نے کہا۔ یہی ہماری زندگی ہے۔ ہمارے ہاں محبت سے غلامی نہیں

خوشی ہے۔عشق نہیں۔ہم اکھٹے مل کر ناچتے ہیں۔ پھر الگ ہو جاتے ہیں ایک سے دو اور دو سے دائرہ بنا لیتے ہیں۔ اور اس دائرے میں سارے پرستان کو شریک کر لیتے ہیں۔ لیکن پریزاد نے چاہا کہ وہ شہزادی کو سارے پرستان سے الگ کر دے۔ وہ صرف اس کی ہو کر رہ جائے۔ کسی سے بات نہ کرے نہ ہنسے نہ ناچے نہ گائے۔ وہ دن بھر اس کی صورت تکتا رہتا۔ اور اس کے لبنا تی چہرے پر غم کی پرچھائیاں آ تی گئیں ہونٹوں پر پپڑیاں جمتی گئیں اور سانس کی لے سے آہ نکلنے لگی . . . .

پھر کیا ہوا؟

شہزادی کو بھی پریزاد سے بے حد محبت تھی۔ لیکن اس محبت میں وہ غلامی کا پرتو دیکھتی تھی۔ اپنی شخصیت کو اپنی ذات کو۔ اپنی انا کو الگ دیکھتی تھی۔ اس نے پریزاد کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ بہت کوشش کی۔ لیکن پریزاد کی محبت بڑھتی گئی۔ بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ پرستان کی فضا پر ایک کالا بادل بن کر منڈلانے لگی۔ پرستان کے سب لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ یا الٰہی اب کیا ہو گا؟

پھر کیا ہوا؟

پھر یہ ہوا کہ شہزادی نے کھمبوں کے جنگل میں جا کر کھمبوں کے سب سے بڑے درخت کے گرد طواف کیا۔ اور اپنی سہیلیوں کو لے کر ناچنے لگی۔ اور دعا کی

کہ وہ اُسے اِس قید سے بچا لے۔ کھمبوں کے سب سے بڑے درخت نے اس کی فریاد
سُن لی۔ اور اُسے اپنے دامن میں پناہ دی۔

اب پریزاد مارا مارا پھرنے لگا۔ شہزادی کی تلاش میں، اب پرستان کے
لوگ اس پر ہنستے تھے۔ اب تو وہ ہنستے بھی نہیں، خیر، جب شہزادی کہیں نہ ملی
تو وہ بھی کھمبوں کے سب سے بڑے درخت کے پاس آیا۔ اور فریاد کرنے لگا۔ تو درخت
نے کہا کہ شہزادی کسی کی شخصی جائداد نہیں بن سکتی۔ اس لئے اُسے سزا دی جاتی ہے
اور شہزادی کو اس سے چھین لیا گیا ہے۔

اس پر پریزاد بہت رویا۔ چیخا چلایا۔ اور اپنی سچی محبت کی قسمیں دینے لگا۔
آخر درخت کا دل پسیجا۔ اور اس نے بتایا۔ کہ اُس نے شہزادی کو شبنم کے
ایک قطرے میں چھپا دیا ہے۔ جس دن پریزاد اس قطرے کو ڈھونڈ سکے گا شہزادی
اس کی ہو جائے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے . . .

بس اس دن سے پریزاد شہزادی کی تلاش میں شبنم کے قطروں میں جھانکتا پھرتا
ہے۔ لیکن پرستان میں شبنم کے قطرے ان گنت ہیں۔ اور ان کی زندگی بہت کم ہوتی
ہے۔ وہ چمکتے ہیں۔ اور گم ہو جاتے ہیں۔ اور شہزادی ایک شبنم کے قطرے سے دوسرے
شبنم کے قطرے میں رقص کرتی جاتی ہے۔ اور کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ شبنم

کے قطرے ان گنت ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس بوند' کس موتی میں پنہاں ہے اور پریزاد صبح و مسا اُسے تلاش کرتا ہے۔ اور ناکام رہتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی وہ کسی بچے کو نظر آجاتی ہے۔ جیسے تم نے ابھی اُسے دیکھا۔

اتنے میں پریزاد بھاگتا ہوا واپس آگیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھ سے کہنے لگا۔ وہاں تو ـــــ نہیں ہے! ہائے اب میں کیا کروں! کہاں جاؤں! پھر ٹڈے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ چلو جلدی چلو۔ کھمبوں کے جنگل میں۔ ٹڈے نے اُسے کاندھے پر سوار کر لیا۔ جب وہ چلنے لگا تو میں نے پریزاد سے پوچھا۔ تمہاری شہزادی کا نام کیا ہے۔

"حُسن!" اُس نے آہ بھر کر کہا۔

اور تمہارا؟

"عشق!" اس نے سر جھکا کر کہا۔ پھر بولا۔ کیوں؟ تمہیں میرے نام سے کیا غرض ہے؟

کچھ نہیں۔ میں نے کہا۔ یونہی پوچھ لیا۔ لو یہ گنّا!

نہیں نہیں۔ پریزاد نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ مجھے گنّے سے کوئی رغبت نہیں۔ مجھے آگ پسند ہے۔

"گنّے کا رس آگ کو بجھا دیتا ہے!" میں نے مسکرا کر کہا "لو کھاؤ اسے!"

یکایک ٹڈا قہقہہ مار کر ہنسا۔ اور فضا میں جن سے لاکھوں بلبلے پیدا ہو گئے۔

اور جس سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے گئے۔ اور آبشاروں کے گیت سے کان گنگ ہونے
لگے۔ اور دھوپ کی ندی اوپر ہی اوپر چڑھتی گئی۔ اور آسماں کی چھت سے لگ کر
فوارے کی طرح لاکھوں قطروں میں گرنے لگی۔ اور ہر قطرے میں شہزادی کا رقص تھا
اور بارش کی پھوار تھی اور دھندلکا۔ جو گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر تاریکی اور تاریکی اور
دو ٹمٹماتے ہوئے جگنو اور دو گہری سبز آنکھیں جو گہری سبز ہوتی گئیں۔ اور پھر تاریکی
میں گھل گئیں اور پھر کچھ نہ تھا۔ نہ تاریکی۔ نہ روشنی۔ نہ احساس، نہ زمیں۔ نہ آسمان.....
. خلا........ مکمل خلا...... .

(۲)

خلا اور نیم دھندلکا اور مدہم مدہم گھنٹیوں کا شور، جو بڑھتا بڑھتا ساری فضا پر
چھا گیا۔ اور ساکت احساس پھر بیدار ہوتے گئے۔ اور نیم تاریک فضا میں منقش ستون
نظر آئے، اور لوبان اور اگر کی خوشبو، اور ایک ہاتھ جو گھنٹی بجا رہا تھا اور دیوتا پتھر کا
خاموش دیوتا سامنے تھا۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ یہ میرا ہی ہاتھ تھا جو گھنٹی سے
آواز پیدا کر رہا تھا۔ میں ایک پجاری برہمن تھا۔ اور دھوتی پہنے ہوئے ماتھے پر تلک
لگائے ہوئے اشلوک گنگنا رہا تھا۔ اور میری نگاہیں دیوتا سے بھی پرے، مندر کی چھت
سے بھی پرے، آسماں کا سینہ چیر کر اوپر بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ گھنٹیوں کے شور کے ساتھ۔

مجھے معلوم ہوا۔ میں بڑا پرہیزگار ہوں، ونرات سندھیا۔ پوجا پاٹ کرنے والا ہوں۔ ایشور کا بھجن کرنے والا۔ چوبیس گھنٹے پرماتما کے دھیان میں مگن رہنے والا میری ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی۔ سر بھی گھٹا ہوا تھا۔ ہاں منڈے ہوئے سر کے بیچ میں گائے کے کھر کی برابر ایک چوٹی تھی جس میں گرہ پڑی ہوئی تھی، میرے ہاتھ میں رام نام کا جالہ تھا اور اس جالے کے اندر ایک مالا تھی، جس کے ہر منکے کو میں دن میں ایک ہزار ایک بار گھماتا تھا۔ مالا میں ایک سو ایک منکے تھے۔ دن میں چوبیس گھنٹے اور ساٹھ منٹ میں، ساٹھ سیکنڈ تھے۔ اور ایک سیکنڈ میں ایک بار رام نام! سوتے سوتے بھی میرا ہاتھ برابر مالا پھیرتا رہتا خود بخود مشین کی طرح اور سوتے ہوئے بھی میرے مُنہ سے رام نام کے گنگنانے کی آواز نکلتی، اور میرا منہ ہر وقت آسمان کی طرف رہتا۔ ایسا احساس ہوتا کہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، ناچتے گاتے، ہنستے بولتے، گھنٹی بجاتے، پوجا پاٹ کرتے میری نگاہیں ہر وقت آسمان کی طرف لگی رہتیں۔" بھگوان .. بھگوان ..... تو کہاں ہے؟۔

کسی نے مجھ سے کہا۔ اے جہرشی، میری بیوی بیمار ہے۔ اچھی ہو جائیگی؟

جو بھگوان کی اچھا!

مہرشی آج سے تین دن سے رو آجاتے۔

جو بھگوان کی اچھا!

مہرشی۔ مجھ پر رشوت کا مقدمہ چل رہا ہے۔ مجھے بچا لیجئے۔

جو بھگوان کی اچھا۔

براہمن دیوتا۔ میں نے ایک رشوت خور پر مقدمہ دائر کیا ہے۔ ملزم کو سزا دیجئے

میری محنت بر آئے بھگوان!

جو بھگوان کی اچھیا۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا۔

میں ہر وقت آسمان کی طرف تاکتا رہتا اور اپنے بھگوان کے حضور میں پہنچنے کی کوشش کرتا۔ دل میں، جسم کے روئیں روئیں میں، روح کے مسام میں، میں اڑ کر بھگوان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتا۔ وہ بھگوان جو مجھ سے اتنی دور۔ اُس سنار نیلے آکاش کے مرکز میں براجمان تھے .... میری آنکھیں بے اختیار اوپر اٹھ جاتیں۔ ہاتھ بھی بے اختیار دعائیہ انداز اختیار کر لیتے اور میرے لبوں سے صدا نکلتی . . . .

اے بھگوان مجھے درشن دو۔ مجھے اپنے پاس بلا لو پرماتما!

ہر وقت یہ گمان ہوتا کہ میں اب اڑا کہ اب اڑا۔ لیکن پاؤں ابھی تک زمین کی گندی مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا زمین کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اور ہزار کوشش کے باوجود باہر نہیں نکل سکتے۔ اسی لئے تو میں اکثر بے تاب ہو جاتا

تھا۔ اور بے چین ہوکر پھڑپھڑانے لگتا تھا۔ اور آخر ناکام ہوکر رہ جاتا تھا۔ کیونکہ میری آنکھیں آسمان پر تھیں لیکن پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے اور میں اُڑ نہ سکتا تھا۔ اور اپنے پرماتما کے درشن سے محروم تھا۔ گو ریاضت کے نور سے میرا دل اور روح اسی طرح شاداب تھے۔ جس طرح پانی کی فراوانی سے دھان کی کھیتی لہلہاتی ہے۔ لیکن پھر بھی میرے دل میں ایک تمنا تھی۔ میرا پرماتما۔ میرا مالک مجھے مل جائے۔ اور میری حسرت بھری نگاہیں ہمیشہ آسمان پر لگی رہتیں۔ اگر کسی طرح میں اُڑکر آسمان کے اُس مرکزی نقطے پر جا پہنچوں اور اپنے ایشور کے چرن پکڑ لوں تو کیا وہ میری روح کو دھتکار دیں گے وہ روح جو اُس ربِ عظیم کی شخصیت کا عنصر ہے۔

لیکن میں اڑوں کیسے؟

ہائے یہ اونچا اونچا آسمان!

مندر میں، گھر میں، گلی میں، سڑک پر، بازار میں، دریا کے کنارے، کنج میں، ہر جگہ ہر وقت کہیں نہ کہیں مجھے عورت نظر آجاتی تھی، لیکن کثرتِ ریاضت نے مجھے ابھی تک عورت سے بے گانہ سا رکھا تھا۔ میں عورت کو ایک دیوی سمجھتا تھا۔ جیسے مندر میں ایک دیوی ہوتی ہے۔ ایک ماں۔ جس کی خوبصورتی تقدیس کے جذبے کو بیدار کرتی ہے۔ جس کی مامتا مجھے ہر بار بیٹا بن جانے پر مجبور کرتی ہے۔ اور یہ شفقت اور یہ

تقدیس تو پر تو تھا اس خالقِ ارض وسما کی شخصیت کا کہ جس کے تقدس اور جس کی شفقت کا ایک حقیر سا حصہ عورت کے دل میں بھی اتر آیا تھا۔

اور میں اپنی آنسوؤں بھری ہوئی آنکھوں سے اپنے پیارے بھگوان کی طرف دیکھنے لگتا۔ جو میری نظروں سے بہت دور، اپنے سماوی تخت پر بیٹھے تھے۔ جہاں میں اُڑ کر پہنچنا چاہتا تھا۔

میں اپنی دنیا میں، اپنی تلاش میں، اپنی کاوش میں اس قدر منہمک رہتا کہ عمر کے پچیس برس گزر جانے پر بھی مجھے کسی عورت سے محبت کرنے کا خیال بھی نہ آیا۔ اسی لئے تو میں نے جُوہی کی اداؤں کو نہ سمجھا۔ وہ جُوہی جو سچ مچ جُوہی کی طرح سُندر تھی وہ جُوہی جو ہمیشہ سفید لباس پہن کر مندر میں آتی تھی۔ وہ جُوہی جو مجھ سے سنسکرت کے اشلوک سنتے سنتے میری آنکھوں کی طرف تکتی رہتی، وہ جُوہی جو ماتھا ٹیکتے وقت کتنے ہی عرصے تک اپنا سر میرے پاؤں سے لگائے رکھتی حتےٰ کہ میرے پاؤں جُوہی کی آنکھوں کی شبنم سے دھوئے جاتے، وہ جُوہی جو گھنٹوں مندر کی دیوار سے، دہلیز سے، ستونوں سے لگی کھڑی رہتی۔ اور نوجوان پجاری کو پوجا کرتے ہوئے دیکھتی، جو دنیا و مافیہا سے بے خبر پوجا کرتا۔ اور ہاتھ اوپر اٹھا کر مندر کی بلند و بالا چھت سے بھی اوپر اس وسیع خلا کی طرف دیکھنا چاہتا جہاں اس کا پرماتما رہتا تھا۔ اور جُوہی اس کے چہرے کی

طرف دیکھتی، اس کے طاقتور ننگے بازوؤں کی طرف دیکھتی اور پھر اُس کے پاؤں کی طرف دیکھتی جو سرسراتی ہوئی ریشمین دھوتی کے رنگین کناروں اور سلوٹوں کے ماہر اک کنول کی طرح کھلے ہوئے نظر آتے۔

اور جوہی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے

اور نوجوان پجاری جو میں تھا اُسے تسلی دیتا اور کہتا۔ گھبراؤ نہیں جوہی تجھے پرماتما صرور ملیں گے ...... ہے بھگوان! تیری لیلا اپرم پار ہے!

اور پھر میری نگاہیں آسمان کی جانب اُٹھ جاتیں!

کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا کہ یہ براہمن کوئی اور ہے۔ میں نہیں ہوں۔ میں ہوں اور نہیں ہوں۔ خود ہی تماشہ ہوں، اور تماشائی بن کر محو تماشہ بھی ہوں پھر ایک دن میں نے اس نوجوان پجاری کو یعنی اپنے آپ کو مندر کے دیوتاؤں کے قدموں پر زار و قطار روتے دیکھا۔ گڑگڑا کر دیدار کی خواہش کا اظہار کرتے دیکھا پھر مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں بے ہوش ہوا جا رہا ہوں۔ مجھ میں ذرا بھی ہلنے جلنے کی سکت نہیں رہی۔ میں دیوتا کے قدموں میں بے ہوش پڑا ہوں۔ روشنی کی ایک کرن پتھر کے دیوتا کے لبوں تک آئی۔ اور یکایک سارا مندر جگمگا اٹھا اور نور بھی پگھلتا گیا۔ اور خوش آئند نغموں نے مجھے اپنی لہروں پر اٹھا لیا۔ اور اچھال کر آسمان کی طرف

پھینک دیا۔ آہا۔ اب میں اُڑا جا رہا تھا۔ ہلکا پھلکا۔ بے وزن۔ اس نیلے آسمان کی فضاؤں میں اُڑا جا رہا تھا۔ چاروں طرف نیلا آسمان تھا۔ بس اور کچھ نہ تھا۔ اوپر نیچے صرف نیلاہٹ۔ گہری، بالکل لامتناہی نیلاہٹ میں اوپر ہی اوپر اڑتا چلا گیا۔ پھر بھی یہ گہرائی ختم نہ ہوئی۔ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ میں اوپر اڑا چلا جا رہا ہوں، یا اس نیلاہٹ کے نیچے دھنسا جا رہا ہوں۔ یہ آسمان ہے یا اندھا کنواں ہے جس میں نیلاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں۔ دن، ہفتے سال گزرتے گئے۔ اور میں اسی نیلاہٹ کے بھنور میں اڑتا رہا۔ جوں جوں اوپر، اور اوپر اُڑنے کی کوشش کرتا یہ نیلاہٹ گہری ہوتی جاتی۔ اور اگر نیچے آنے کی کوشش کرتا تو بالکل اپنے پاؤں تلے مکڑی کے لاکھوں جالے تنے ہوئے دکھائی دیتے۔ یہ مکڑیاں مجھے زندہ کھا جائیں گی۔ اس لیے میں ان جالوں سے اوپر ہی اوپر اڑتا رہتا۔ لیکن یہ جالے اب ہر وقت میرے پاؤں سے ذرا نیچے ہی رہتے۔ اور میں ہزار۔ اوپر اُڑنے کی کوشش کرتا۔ یہ جالے میرے پاؤں تلے ہی رہتے۔ معلوم ہوتا کہ اب گرا کہ اب گرا۔ جوں جوں میں اوپر اُڑتا یہ جالے بھی اوپر آتے گئے۔ اور میں وہاں چمگادڑ بن گیا۔ جسے آسماں اور زمین، دونو نے حوالے کر دیا تھا۔ نہ اوپر پہنچ سکتا تھا۔ نہ نیچے کی سمت جا سکتا تھا۔ اوپر نیلاہٹ کا بھنور تھا۔ تو نیچے مکڑیاں۔ اور میں ایک حقیر سیارے کی طرح اس نظامِ شمسی میں

گھوم رہا تھا۔ آوارہ بے مطلب جیسے میری زندگی کے یکلخت دو ٹکڑے ہو گئے ایک
بدنے لوٹنے والا۔ ایک طنز کرنے والا۔ دونوں کے دھڑ جڑے ہوئے تھے جیسے جڑواں
بچوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں براہمن اب ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرتے
رہتے۔ کیا دونوں براہمن تھے۔ یقین نہیں آتا۔ کیونکہ ایک کی شکل تو اس قدر بری
تھی۔ اس قدر منحوس تھی، ڈراؤنی تھی، کہ اسے دیکھ کر مجھے اپنے آپ سے سخت گھن
آتی تھی۔ ایک راکشس تھا ایک براہمن۔ ایک شیطان، ایک یزدان، ایک جیکل
ایک ہائیڈ۔ لیکن تھے دونوں میں۔ میں بھی دونوں میں تھا۔ یہ دونوں ہر وقت
مباحثہ کرتے رہتے، تو تو میں میں کرتے۔ گالی گلوچ کرتے، گتھم گتھا ہو جائے، ایک
دوسرے پر الزام دھرتے کہ اس مسلے کی وجہ سے میں اس حالت کو پہنچا تھا۔ آخر
میں نے فیصلہ کیا کہ اگر بھنور سے نجات حاصل کرنا ہے۔ تو یہی بہتر ہے کہ مکڑی کے
جالے میں پھنس جاؤں، شاید اس جال کو توڑ کر زمیں کی طرف قدم بڑھائیں اور
زمیں کی کشش اپنی طرف کھینچ لے۔ بھنور سے نکلنے کا یہی صحیح طریقہ ہے کہ آدمی
بھنور کے مرکز میں سب سے نیچے چلا جائے اور پھر بھنور کو اپنے گرد گھومنے دے
بھنور ایک عرصے کے بعد اس آدمی کو نشیب سے بلندی پر لے آئے گا لیکن یہاں تو
بلندی میسر تھی۔ پستی کی حاجت تھی)۔ اور دونوں براہمن لڑ رہے تھے۔ مجھے معلوم

ہے کہ جب میں نے یعنی ہم دونوں نے لڑتے جھگڑتے ہوئے نیچے غوطہ لگایا تو میں زیادہ ڈیرا مبدرہ تھا۔ پاؤں جھن سے مکڑی کے جالے سے ٹکرائے اور پھسل کر نیچے گرتے گئے۔ اب میں پیپل کے ایک اونچے درخت کی پھنگوں پر سے گر رہا تھا ایک کوّا مجھے دیکھ کر زور زور سے قہقہہ لگانے لگا۔ مجھے یعنی کہ ہم دونوں کو۔ پھر میں نے دیکھا۔ کہ میری روح کے دونوں حصے وہیں ہوا میں پیپل کی شاخوں کے اوپر معلق ہیں۔ اور میں مندر کے قریب گلی میں کھڑا ہوں۔ اتنے میں جوہی آئی اور میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ میں نے پوچھا تم کیا چاہتی ہو وہ پیپل کے پیڑ کی طرف اشارہ کر کے بولی وہ دونوں براہمن کب تک معلق رہیں گے؟

میں جواب دونوں سے الگ تھا۔ اور شاید نہیں بھی تھا۔ کیونکہ وہ دونوں بھی مجھے اپنا آپا ہی معلوم ہوتے تھے۔ اب ان دونوں سے استفسار کرنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ تم کیا چاہتے ہو؟

ایک نے کہا۔ زمین پر اترنا چاہتے ہیں

دوسرے نے کہا۔ غلط ہے۔ میں چمگادڑ بن کر اُلٹا لٹکنا چاہتا ہوں۔

پہلے نے کہا۔ مجھے جوہی کے پاؤں کی مٹی لا دو۔ اور میرے سینے سے لگا دو

بس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!

دوسرے نے کہا۔ غلط ہے۔ مجھے بول براز چاہیئے۔ ہاہاہا

پہلے نے کہا۔ خدا کے لئے۔

دوسرا بولا۔ شیطان کے لئے

میں نے کہا۔ اب کیا ہو گا۔

دوسرے نے کہا۔ میں بھوکا ہوں۔ میں بھوکا ہوں۔ مجھے بول براز چاہیئے
میں بھوکا ہوں۔ اور یہ کہکر اس نے پہلے کو کھانا شروع کیا۔ اور پہلا چلّانے لگا۔ مجھے
بچاؤ، مجھے رس پرانے دو۔۔۔۔۔

میں بھاگا بھاگا جوہی کے پاس گیا اور اس کے پاؤں کی خاک چٹکی میں لی
اور پیپل کی آخری پھننگ پر پہنچ کر ان دونوں پر چھڑک دی یکایک مجھے ایک جھٹکا
سا لگا۔ اور پیپل کے درخت کی سب شاخیں ٹوٹ گئیں اور میں دھم سے زمین پر آگرا
فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا اور وہ دونوں ایک ہوتے ہوئے معلوم ہوئے جیسے
ایک سانپ نے دوسرے سانپ کو کھا لیا ہو۔ نہ معلوم شیطان نے یزداں کو ہڑپ
لیا تھا۔ یا براہمن نے راکشس کو۔ مگر میں نے ان دونوں کو اور اپنے آپ کو ایک
عجیب و غریب طریقے سے شیر و شکر کی طرح ایک ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ جوڑ جوڑ
دکھ رہا تھا۔ اور مندر کی چار دیواری تھی۔ اور میں زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اور

جوہی میرے پاس تھی

یکایک وہ براہمن جو میں تھا اٹھ بیٹھا اور جوہی سے پوچھنے لگا۔ تم کون ہو!

میں ایک بیوہ ہوں۔ جوہی نے کہا۔

مجھ سے شادی کرو گی۔ براہمن نے کہا

جوہی نے کہا۔ میں بیوہ ہوں۔ تم دیوتا ہو۔ میں گناہ گار ہوں۔ تم براہمن ہو

مجھے خوشی نہ دو۔ غم دیدو

براہمن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا آؤ باہر چلیں اب یہ گھر ویران ہو گیا

ہے۔ اس مندر میں اب کوئی نہیں ہے۔ .. ٹھہرو۔ اپنے قدموں کی خاک مجھے دو۔

یہ خاک بدی کو نیکی میں مبدّل کرتی ہے۔ ..!

اور وہ چلنے لگے۔ اور مندر بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اور دیوتا کے

لبوں پر روشنی کی کرن پھیل گئی۔ اور مندر وسیع ہوتا گیا۔ اور ان کے ساتھ چلتا گیا۔

اور صحن وسیع ہوتے ہوتے لہلہاتے سبز سے کھیت بن گئے اور ان میں گندم کے

سنہری پودے لہلہا رہے تھے دیوتا نے پھر سفید آسماں کی طرف دیکھا اور اسے ایک

مرتبہ پھر محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں پھر فرش زمین سے اٹھ رہے ہیں۔ اس نے

گھبرا کر (جوہی) کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب وہ پھر زمین پر تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے

ہاتھ میں ہاتھ دیئے شانہ بشانہ چلے گئے اُفق سے پرے ۔ اُفق سے پرے ۔ ۔ ۔
۔ اُفق سے پرے ۔ ۔!!!

(۳)

میں خواب وخیال کی وادی سے گزر کر فہم وادراک کی دنیا میں واپس آ رہا تھا کہ راستے میں حضرت ل گئے
بولے ۔ کیا سمجھے ؟

میں نے اس بچّے کی طرح جسے نیا سبق ملا ہو رکتے رکتے کہا ۔ یہی ۔ کہ پرستان اسی دنیا میں ہے ۔ اور ۔۔۔ اور خدا بھی اسی دنیا میں ہے اور آسمان کی طرف بار بار تاکنا گناہ ہے !

شاباش ! انھوں نے تھپکی دے کر کہا ۔ اور عشق ؟
میں نے کہا ۔ محبت میں غلامی نہیں ہوتی ، بیوگی نہیں ہوتی ، موت نہیں ہوتی اور جب کوئی محبّت کو غلام یا بیوہ یا مردہ بنانے کا خیال کرتا ہے ۔ تو حُسن اس دنیا میں تو کیا پرستان میں بھی نہیں رہتا اور شبنم کے قطروں میں چھپ جاتا ہے ۔
شاباش ! یہ کہکر وہ راستے سے الگ ہو کر کھڑے ہوگئے ۔ بولے اب تم جا سکتے ہو ۔
لیکن میں چلتے چلتے رک گیا ۔ ذہن میں ایک سوال آگیا ۔ پوچھ لیا ۔ مگر ایک

مشکل تو حل کیجئے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا۔ کہ ان تمام باتوں کے باوجود پریزاد کی تلاش کیوں جاری ہے ابتک؟

وہ ہنسے۔ کہنے لگے "اچھا ہے کہ تم عشق کی ماہئیت سے غافل ہو رہو۔ جس دن تم اسے سمجھ لو گے۔ اس کے بعد تمہیں زندہ رہنے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی۔
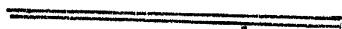
جگن ناتھ

"وہ علی گڑھ کے مضبوط، سیاہ رنگ کے آہنی ٹرنک آپ نے بھی اکثر دیکھے بلکہ خریدے ہونگے، جن کی پشت پر "کارخانہ جگن ناتھ کھتری" لکھا ہوتا ہے۔ اور اس ٹھپے کے گرد ایک سفید دائرہ کھنچا ہوتا ہے۔" "دیکھے ہیں نا آپ نے؟ بس، سمجھئے، ٹرنکوں میں یہی اصلی مال ہے اور اس سے بڑھیا آہنی صندوق صرف گاڈریج والے بناتے ہیں ورنہ ہندوستان میں کوئی کارخانہ لالہ جگن ناتھ کھتری کے کارخانے کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ہاں بھوت ناتھ جی کی بات الگ ہے، لیکن اس وقت تو میں خوشبودار تیل نہیں، آہنی صندوقوں کا ذکر کر رہا تھا۔ ہاں۔ سمجھے آپ! علی گڑھ دو چیزوں کے لئے مشہور ہے۔ ایک تو

مسلم یونیورسٹی اور دوسرے رام آپ کا بھلا کرے ۔ یہی لالہ جگن ناتھ کھتری کا کارخانہ بہترین ٹرنک ساز میرے کارخانے میں کام کرتے ہیں . . .

لالہ جگن ناتھ کھتری اسی طرح، اسی انداز میں، اپنی نشست پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنی مونچھوں کو درست کرتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو اپنی سفید دھوتی کی تہوں میں چھپاتے ہوئے، ریل گاڑی کے ڈبے سے باہر دیکھتے ہوئے باتیں کرتے جاتے ہیں۔ اس کی بہت پرانی عادت ہے، کہتے ہیں میں اپنی کمپنی کا خود چلتا پھرتا اشتہار کیوں نہ بنوں۔ لوگ ریل گاڑی میں ہزاروں روپے صرف کر کے اشتہار دیتے ہیں۔ ہم ایک پیسہ صرف کئے بغیر اپنے کارخانے کا اشتہار دے رہے ہیں۔ کیا برا ہے؟ واہ یہ ریلوے والے خود اپنی ریل کا اشتہار نہیں دیتے۔ دیکھ لو۔ پڑھ لو۔

مسافروں کی نظریں ایک بڑے پوسٹر پر جم گئیں۔ جو ڈبے کے اندر اک لکڑی کے چوکھٹے میں لگا تھا جگناتھ کے معروف مندر کی تصویر بھی جو پوری میں واقع ہے۔ اور جس کی زیارت کے لئے لاکھوں ہندو ہر سال جاتے ہیں۔ جگناتھ کی تعریف سارے ہندوستان میں گائی جاتی ہے۔ کیونکہ جگناتھ دیوتا کے دونوں ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں۔ مورتی میں اور تصویر میں بھی ہمیشہ اسی طرح دکھایا جاتا ہے۔ اسی دیوتا کے عظیم الشان مندر کی

تصویر تھی۔ جو پوری میں واقع ہے۔ اور نیچے جلی حروف میں لکھا تھا "ہندوستان کی سیر کیجیے" دیکھا آپ نے۔ لالہ جگن ناتھ کھتری بول اُٹھے۔ ریلوے پوری میں بھگوان جگناتھ کے مندر کی تصویر لوگوں کو دکھا رہی ہے تاکہ لوگ جوق در جوق ریل پر سفر کر کے پوری جائیں۔ ورنہ یہ ریل کوئی ہندو تھوڑے ہی ہے۔ ہے ہے ہے

لالہ جگناتھ کھتری اپنے پیلے دانت نکال کر ہنسے۔ اور مجھے ان کے منہ سے اک عجیب قسم کی غلیظ بساند، کچا مد، ھکراند آئی۔ ایسی کراہیت آمیز ہنسی تھی اُن کی معلوم ہوا سارے ڈبے میں کسی نے گندگی اُچھال دی۔ بوڑی لاڈر کا کوئی نسخہ اس خبیث منہ کے لئے کارآمد ثابت نہ ہوسکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بدبو جسم سے نہیں روح کے ذرے ذرے سے پھوٹ رہی ہے۔ میں راستے بھر اس کا کھاجا ہوں۔ خیر۔۔۔ ۔ ۔

لالہ جگن ناتھ کا قد ناٹا اور جسم موٹا ہے، اس کے چہرے کا رنگ اس کے کارخانے کے بنا کردہ ٹرنکوں کی طرح سیاہ ہے، لالہ جی کی کھال بھی آہنی چادروں کی طرح مضبوط اور کھیلی معلوم ہوتی ہے۔ سنا ہے جوانی میں بہت کسرت کرتے تھے۔ لیکن اب باتیں بہت کرتے ہیں۔ گو سر اب بھی گھٹا ہوا ہے اور چٹیا کے بال چھدرے ہوتے جا رہے ہیں اور مونچھیں بھی سپید ملگجی سی۔۔۔۔۔ چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا کسی لے ساہ ٹرنگ میں سفید تالہ لگا دیا ہو۔ لیکن لالہ جی کے منہ کا تالا قریباً قریباً ہر وقت کھلا رہتا ہے

وہ ہر وقت باتیں کرتے رہتے ہیں۔ باتیں نہ کریں تو رال ٹپکاتے رہتے ہیں۔ رال نہ ٹپکائیں تو کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے جس دن وہ بات نہ کرینگے۔ وہ دن اُن کی موت کے بعد آئے گا۔ ایشور نہ کرے وہ کبھی مریں میں تو اُن کے کارخانے میں جنرل منیجر ہوں۔ پھر اُن کا بھانجا ہوں۔ ان کے قدم کی برکت سے یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے ۔ اور لاکھوں روپے کا ہیر پھیر دن بھر میں ہو جاتا ہے۔ کیا آپ اسے بھی اشتہار تو متصور نہیں کر رہے میرا مطلب ہے۔ ''

لالہ جگن ناتھ اپنے ایک مسافر ساتھی سے بات چیت کی راہ نکالتے ہوئے بولے۔ یہ میرا لڑکا ہے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ صاحب دن بھر سوٹ ڈانٹے رہتا ہے میں اسے کچھ کہتا نہیں ہوں۔ کیونکہ ابھی جوان ہے' پہلے صاحب یہ شاید کہانیاں لکھتا تھا۔ آج کل ٹرنک بیچتا ہے۔ اس لئے میں ذرا اسے ڈھیل دیتا ہوں۔ تاکہ کام سیکھ جائے۔ اور کہانیاں لکھنا بھول جائے۔ صاحب، انگریزوں نے تو ہمارے لونڈوں کا بالکل ستیاناس کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں کون کہانی بھسانہ لکھتا تھا۔ ایک یو گی تلسی داس کی رامائن' سو وہ تو تیرا ناناس ہے۔ اب یہ نئے چھوکرے کیا لکھیں گے جی' میں ذرا لکھنؤ لئے جا رہا ہوں اسے تاکہ بزنس کا کچھ اور چھورے اسے پتہ چلے تو کہیں ٹھکانے سے کام کرے۔ ارہ یہ گاڑی تو بہت تیز جا رہی

ہے۔ طوفان میں ہے نا مگر صاحب آج کل تو ڈرائیور ذرا آرام سے گاڑی چلائے
تو اچھا ہے۔

کیوں؟ ایک مسافر بولا جس نے اپنا نام رام دلارے بتایا تھا۔ راجستھان
کا رہنے والا تھا۔ کلکتے میں منیکر تھا۔ جب وہاں بمب پڑے تو بھاگ کر دہلی چلا آیا۔ اب
اپنے کسی کام سے لکھنؤ جا رہا تھا۔ دونوں کلّوں میں پان داب رکھے تھے۔ یہ اس لئے کہ
دونوں کلّے اندر کی طرف دبے ہوئے تھے اگر منہ میں دونوں طرف پان دابکر رخساروں
کو ویز نہ بناتا تو بالکل کسی بڈھے چھچھوندر کے سے دکھائی دیتے۔ یہ کلّے پھر یہ پان جو ہر
وقت منہ میں دابے رہتا تھا۔ اس سے کلّے بڑے بڑے اور بھرے بھرے دکھائی دیتے۔

"رام دلارے جی" جگناتھ کھتری پان کھاتے کھاتے بولا۔ اس کانگریس نے لٹیا
ڈبو دی۔ اس جنگ کے زمانے میں جبکہ دشمن سر پر چڑھا آ رہا ہے گھر میں لڑائی کا سس
باندھئے رکھ دیا کہتے ہیں کانگریس کے ابھی آزادی دو۔ سوراج۔ ہونہہ صاحب
ہمیں تو آج کل دانوں کے لالے پڑ رہے ہیں۔ اور یہ لوگ سرکار سے لڑنے کی ٹھان رہے
ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں جو لوگ سرکار کو دق کرتے ہیں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔

"جیل میں سڑا کرتے جاتے ہیں" مولوی کرم علی نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا
لیکن مولوی جی کانگریس تو اب جیل میں ہے۔ اب بدمعاش لوگوں نے ریس

اُکھاڑنا شروع کر دی ہیں۔

"بائیں" رام دلارے نے گھبرا کر پوچھا۔

جی صاحب۔ کیا سمجھے جگناتھ کھتری نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ اس لائن پر بھی کئی بار حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

ایک اور مسافر نے گھبرا کر پوچھا "اب لکھنؤ کتنی دور ہے"

ابھی تو چار سٹیشن باقی ہیں۔ پہلے اوکھلہ آئے گا۔ پھر سندیلہ، پھر بیچی پور کا گاؤں پھر بیتا نگر، پھر لکھنؤ۔

"ہائے لکھنؤ" ایک لکھنوی چیخا۔

علی گڑھ۔ بس۔ علی گڑھ ہائے وہ رس روڈ۔ دُنیا میں اگر کوئی مقام ہے۔ تو وہ علی گڑھ۔ علی گڑھ کی دو چیزیں مشہور ہیں۔

مگر جگناتھ کھتری کی بات اس بیچالی نے ختم نہ ہونے دی جو ایک کونے میں ٹانگیں پھیلا دے تین آدمیوں کی حلقہ گھیرے بیٹھا تھا۔ وہ وہیں سے دھاڑا ہائے لاہور۔ میں قربان . . . لاہور بس لاہور ہے" ایک کبڑا کھڑکی کے شیشے پر تیزی سے جیا تا ہوا ایک ور زمیں گھس گیا درازمیں گھس کر اس نے اپنا چھوٹا سامنہ باہر نکالا اور ڈبے کے مسافروں کو گھور کر کہنے لگا۔ بکتے ہو تم سب۔ یہ درز جس میں میں رہتا ہوں۔ دنیا

کا حسین ترین مقام ہے۔

رام دلارے نے کھڑکی کا شیشہ اوپر چڑھا دیا۔ دراز کہیں غائب ہو گئی۔ مولوی کرم علی نے کھانس کر کہا۔ کچھ بھی ہو ہندوستان کا مسلمان اس تحریک سے الگ ہے۔ وہ اس تحریک پر تین حرف بھیجتا ہے۔ یہ ہندو کی چالاکی ہے۔ حکومت کو مرعوب کرنا چاہتا ہے۔

مگر مولوی صاحب ملک بھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ مشین گنیں چل رہی ہیں۔ بہار میں ہوائی جہازوں کے ذریعے کالوں کے مجمع کو تتر بتر کیا جا رہا ہے۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔

"آزادی پسندوں کو اس وقت انگریز کا ساتھ دینا چاہیئے تھا۔" ایک کھدر پوش سگار پیتے ہوئے بولا ملک کو اس وقت آزادی کی ضرورت اس قدر نہیں جتنی فسطائیت کا مقابلہ کرنے کی۔ ہمارے ملک کے رہنماؤں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا۔ نتیجہ آگ اجری بماری، قتل و غارت اور دشمن سر پر ہے۔ یہ کیا حماقت ہے!

جب کھدر پوش سگار اپنی باتیں ختم کر چکا۔ تو کھدر پوش پائپ جو اس کے قریب بیٹھا تھا کہنے لگا۔ سچ کہتے ہو۔ یہ عوام کی جنگ ہے۔ سارے ہندوستان کی جنگ ہے۔ اس وقت ہمیں فسطائیت کا مقابلہ کرنا ہے۔

آزادی پسند احمق ہیں۔

کھدر بوش سگار بولا۔ میں تو کہوں گا وہ غدار ہیں۔

جگنا تھ کھتری بولے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دیکھئے اس جنگ سے ہندوستان کے کارخانوں کو کتنا فائدہ پہنچا ہے۔ میرے کارخانے میں اب پہلے سے سہ گنا مال تیار ہوتا ہے۔ اب تو دساور بھی جاتا ہے۔ میرے کارخانے کا مال۔ سفید ٹھپہ لگا ہوتا ہے میرے ٹرنک پر۔ ارے یہ ٹرنک تو میرے کارخانے ہی کا ہے یہ لو باتوں باتوں میں سدملہ بھی گذر گیا۔ اب شائد بیجی پور آئے گا۔ کیوں ہے . . .   . وہ لالہ جی میری پسلیوں میں چٹکی لے کر بولے۔ پھر مولوی کرم علی سے کہنے لگے۔ بیجی پور میں میرے اس بھانجے کا گھر ہے وہیں اس کے ماں باپ بھائی بہن رہتے ہیں۔ وہیں اس کی وہ بھی رہتی ہے جس سے یہ پریم کرتا ہے۔ ہے ہے ہے . . . . . وہ ہنسے۔

اے خدا اگر تو ہر جگہ ہے تو اس ڈبے میں فنائیل کی بوتل بن جا۔

مولوی کرم علی نے اپنی جیب سے رومال نکالتے ہوئے کہا۔ بیجی پور بڑا خوبصورت گاؤں ہے۔

آپ کو بھی پسند ہے۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

مولوی کرم علی نے کہا۔ ہاں ہماری قرابت داری ہے۔ سیدوں کے گھر میرا بھانجا پہلے پھسا ہے لکھنا تھا مولوی جی۔ جگنا تھ کھتری نے مولوی جی کو

مرعوب کرنے کے لئے کہا۔ کانگریس میں کام کرتا تھا۔ کبت بناتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے کام پر لگایا ہے۔

کانگریس پر تین حرف! کھدر پوش پائپ بولا۔ ریڈیکل پارٹی زندہ باد۔

سگار نے جل کر کہا۔ سالے۔ گورمنٹ کا روپیہ کھاتے ہو۔ تیرہ ہزار تم کو ہر ماہ ملتا ہے۔ کس منہ سے تم آزادی پسندوں کو گالی دیتے ہو۔

سوشلزم بالکل فراڈ ہے۔ مولوی نے اپنی سپید داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ اسلام زندہ اشتراکیت ہے!

رام دلارے ہنسا۔

جگن ناتھ نے کہا۔ سارا فتور ان آزادی پسندوں کا ہے۔ جنگ کے ختم ہونے تک یہ صبر کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ لونڈا بھی پہلے ایسے ہی خیال رکھتا تھا۔ کانگرس میں کام کرتا تھا جی۔ اب جا کر کہیں میں نے اسے آدمی بنایا ہے جی! ہرے رام ہرے رام —— رام دلارے جی ذرا دیکھنا کہیں میرے ٹرنک کی زنجیر ڈھیلی تو نہیں ہو گئی۔ کم بخت یہ گاڑی بھاگم بھاگ چلی جا رہی ہے۔

انٹر کلاس کا ڈبہ نہ تھرڈ کلاس کی سی توانائی رکھتا ہے۔ نہ فرسٹ سیکنڈ کی سی امارت۔ اس کی شخصیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے سماج میں متوسط طبقے کی؛ یعنی

غریبی اور امیری کی سب برائیاں اس میں موجود ہوتی ہیں۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کہیں سہارانہ پاکر میں نے سر کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ اور اپنے گاؤں کی چودھری کا انتظار کرنے لگا۔

تخئیل میں وہ ہرے بھرے کھیت گھومنے لگے۔ آم کے پیڑوں کے نیچے مور ناچنے لگے۔ ہوا کی مہک ناک میں گھسی چلی آرہی تھی۔ کانوں میں کوئل اپنا سُریلا نغمہ ڈھال رہی تھی، اور محبوب کے پائل کی جھنکار اور گھونگھٹ پر شرمیلی نگاہوں اور بے باک قہقہوں کا ہجوم، اور چوپال میں بڈھوں کی باتیں۔ سید اور پنڈت، کھتری اور کائستھ، کمیں اور مزارع سب سیدھے سادے، بے غرض نہیں۔ لیکن رفاقت پسند اتنے کہ جان دینے پر تیار۔ دور سے مہرانی سوائے کا منارہ دکھائی دیگا۔ پھر گاؤں کے کھیت گھومتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سانولے سلونے بچّے ہاتھوں میں غلیل لئے ہوئے چیختے ہوئے گاڑی کے قریب آجائیں گے۔ اُسے دیکھ کر منّو چچا.. منو چچا... کا شور مچائیں گے۔ گاڑی بنگلے کے سامنے سے گذرے گی، عین ممکن ہے کہ وہ بھی

چودھری ابھی آئی بھی نہ تھی کہ گاڑی دھیمی ہوتی گئی۔ پھر زور سے سیٹی بجانے لگی پھر رُک رُک کر چلنے لگی۔ پھر رُک گئی۔

کیا ہوا؟

کیا ہوا؟

بجی پور کا گاؤں آگیا ہے۔

"نہیں تو" میں نے غصہ سے کہا۔

سب لوگ باہر جھانک رہے تھے۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا گاڑی کے آخری ڈبوں کی طرف جا رہا تھا۔

کیا بات ہے۔ سب نے باری باری پوچھا۔

اس نے سر ہلا کر کہا۔ معلوم نہیں۔ غالباً کوئی گائے انجن کے نیچے گئی۔ ہائے، ہائے۔ جگن ناتھ اور رام دلارے نے اکدم کہا۔ بڑا پاپ ہوا۔ بہہ گاڑی میں چڑھنے کا یہی تو دوش ہے۔ پرانے زمانے میں اسی لئے تو ریل گاڑی نہیں بیل گاڑی میں لوگ بیٹھتے تھے۔

پھر ایک آدمی بھاگتا ہوا گزر گیا۔

کیا بات ہے۔ سب نے پوچھا۔

ایک میم کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔

ارے رے رے۔ پور گرل۔ کھدر پوش پائپ نے کہا۔

پھر بہت سے لوگ ڈبوں سے نکل پڑے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

ایک مسلماں گوالا گاڑی کے نیچے آگیا ہے

انا اللہ وانا الیہ راجعون مولوی کرم علی نے کہا

جی ایک بکری۔ گوالا نہیں۔ گائے نہیں۔

نہیں۔ زنانے ڈبے میں ایک بدمعاش گھس گیا اور زبردستی ،

سچ مچ۔ ہے ہے ہے ، بجانے جگناتھ کھتری کو ہنسی کس بات پر آئی تھی۔

ایک جیب کترا کود پڑا۔

بچہ گر پڑا تھا۔ زنجیر کھینچی گئی۔

بھئی یہ پور یہاں سے کتنی دور ہے۔ میں نے پوچھا۔

لو اسے اپنے گاؤں دیکھنے کی پڑی ہے۔ لالہ جگن ناتھ کھتری نے چیں بجبیں

ہو کر کہا۔

دیکھ۔ میں تجھ سے کہے دیتا ہوں۔ میں تجھے سیدھا لکھنؤ لے جاؤں گا۔ پہلے بزنس

کا دھندا کر پھر گھر جانے دوں گا۔ .

اتنے میں گارڈ سامنے سے گزرا۔ اس نے کہا۔ آگے ریل کی پٹری پر سے ایک

مال گاڑی اتر گئی۔ کسی نے شرارت کی تھی غالباً۔ آٹھ ڈبے الٹ کر پاش پاش ہوگئے۔

اسی وقت الٹی ؟

نہیں کل رات کو۔ لائین اُس وقت سے ٹھیک کی جا رہی ہے۔

کس کی شرارت ہو سکتی ہے!

آزادی پسندوں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ لفنگے!

سب کانگریس کا قصور ہے۔ لالہ جگن ناتھ کھتری نے کہا۔

گارڈ نے یکایک مڑ کر کہا۔ نہیں۔ پولیس کل رات سے تفتیش کر رہی ہے۔ جدھ پسا ہوں نے یہی پور کے گاؤں والوں کو ملزم ٹھہرایا ہے۔

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

لونڈے تو تو آزادی پسندوں کے ساتھ کام کر چکا ہے۔ مولوی کرم علی نے میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے سر جھکا لیا۔

یکایک گاڑی دھیمے دھیمے پھر چلنے لگی۔

شکستہ ڈبے لائن کے دونوں طرف نظر آئے۔ پھر اپنے گاؤں کی چودھری سرائے کا منارہ ایک گہرے سیاہ دھوئیں میں ملبوس تھا۔ کھیتوں میں نہ مور تھے نہ کوئی سرکیں تھے۔ ۔ ۔ کوئی بھی تو ہمارے استقبال کو نہ آیا۔ گاڑی آگے بڑھتی گئی، سارے گاؤں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ چھپر جلے ہوئے تھے انگناسیاں خاموش اور پنگھٹ پر

کتے کھڑے تھے۔ اور حیرت سے اور غصّے سے مغلوب ہو کر رو رہے تھے۔

کہیں آدمی کا نشان نہ تھا۔ گھروں سے شعلے اور دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے۔ بس۔

بیجی پور کے سٹیشن پر پولیس کا اژدہام تھا۔ وہ ہر کھڑکی کے سامنے کھڑے نظر آتے تھے۔ اور تحکمانہ لہجے میں پوچھ رہے تھے "کوئی بیجی پور کا مسافر یہاں اتریگا؟"

اور جگن ناتھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کرم علی بولے۔ لڑکے تو نے آزادی پسندوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس وقت تو بھی دھر لیا جائے گا۔ تیرے گولی مار دی جائے گی۔

لعنت ہو ان فسادیوں پر۔ سگار سلگنے لگا۔

ہم مسلمان اس فساد میں شامل نہیں ہیں۔ کرم علی نے ترمیم پیش کی۔

آزادی پسند غدار ہیں۔ یہ عوام کی جنگ ہے۔ ریڈیکل پائپ چہکا۔

کوئی اترنا چاہتا ہے بیجی پور کے اسٹیشن پر؟ پولیس والے نے بالکل میری کھڑکی کے قریب آ کر کہا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور پوچھا "کیا تم بیجی پور کے رہنے والے ہو؟"

"جی نہیں" لالہ جگن ناتھ کھتری نے فوراً جواب دیا۔ یہ لڑکا تو رہتا ہے نامسٹری جی۔ علی گڑھ میں رہتا ہے۔ آپ نے ہمارے کارخانے کا نام ضرور سنا ہوگا" لالہ جگن ناتھ کھتری

ٹرنک بنانے والے" ہے ہے ہے، لیجئے۔ یہ تازہ موسمی کھائیے۔ خاص دہلی سے منگوائی ہیں۔ واہ واہ، رام دلارے جی! آپ بھی چکھئے۔ ارے یہ کیا موسمی ہے! سنتری جی ہم تو ٹرنک بناتے ہیں۔ ہمارے ٹرنک فوج میں جاتے ہیں، ہمیں فسادیوں سے کیا مطلب!

گاڑی چل دی۔

میرے آنسو روکنے سے بھی نہ رُکے۔

اب روتے ہو۔ جگناتھ نے غصے سے کہا۔ پہلے فساد شروع کرتے ہو۔ بعد میں جب سرکار بندوق چلاتی ہے۔ تو روتے ہو۔ اگر پہلے ہی مان جاتے تو ـــــ

ایک گداگر لڑکے نے ڈبے میں داخل ہو کر گانا شروع کیا "ہندوستاں ہمارا، سارے جہاں سے اچھا" میں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ یکایک میری نگاہیں ریلوے کے پوسٹر پر پڑیں اور وہیں جم کر رہ گئیں۔

ہندوستان کی سیر کیجئے "پوری" دیکھئے۔

ہندوستان سارے جہاں سے اچھا ہے۔ اور ہندوستان میں پوری ہے۔ یہاں ہندوستان کا سب سے بڑا دیوتا رہتا ہے۔ جگن ناتھ!

یکایک میرے لبوں پر تلخ مسکراہٹ آئی۔ جیسے اس یتیم نے سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ ہائیں ابھی رو رہا تھا۔ اب مسکرانے بھی لگا۔ کیا بات ہے بیٹے! لالہ جگناتھ نے پوچھا۔

"جی کوئی بات نہیں۔ لالہ جگن ناتھ جی!" میں نے مسکین بن کر کہا

....

گاڑی لکھنؤ سٹیشن کی سرخ بتیوں تک پہنچ گئی تھی۔ لکھنؤ اترنے والے مسافر خوشی خوشی اسباب باندھ رہے تھے۔ اس گداگر لڑکے کی طرف کوئی متوجہ نہ ہو سکتا تھا۔ جو بار بار چیخ کر کہہ رہا تھا۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ ایک پیسہ۔ ..

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ ایک پیسہ.....!

گاڑی سے اترے تو پھر وہی پوسٹر سامنے تھا۔ وہی جگن ناتھ جی کے مندر کی تصویر تھی۔ یہ مندر جو ہندوستان میں واقع ہے۔ یہ دیوتا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں۔

(ادارۂ ہندوستانی پبلشرز دلی نے انتظامی برقی پریس حیدرآباد دکن میں چھپا کر شائع کیا)